اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ

کسوف الشمسین

یعنی

غم شبلی و ماتم حالی

مصنفہ

حافظ و حاجی شاہ سید علی احسن صاحب احسن سجادہ نشین و ممبر منتظم درگاہ حضرات
مارہرہ ضلع ایٹہ

مع

مختصر حالات زندگی شمس العلما مولانا شبلی و شمس العلما خواجہ حالی

مرتبہ

خاکسار نظامی بدایونی

نظامی پریس بدایوں میں چھپا

نظام الدین حسین پرنٹر

بار اول ۵۰۰ جلد | حق تصنیف محفوظ | قیمت فی جلد ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فغاں! کہ از نظرم نوز پیکراں رفتند
ستارہائے شب و روز از جہاں رفتند

امسال سال ہجری اور سال عیسوی دونوں کا روز آخر از روئے علم و ادب غمکدہ دنیا کے لیے بچھوڑ کا دن تھا۔ ہنوز ۱۳۳۳ھ ہجری کے شروع ہونے میں ایک شب باقی تھی کہ داعی اجل نے شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کو جام فنا پلا دیا۔ اور اسی طرح ۱۹۱۵ء کی نمود کو ایک دن رہا تھا کہ ہادم اللذات نے شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی کے عیش زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک ساتھ یہ دو متواتر زخم دنیائے ادب کے لیے وہ گہرے بلکہ آخری چرکے ہیں جن کی مٹیں نہیں مٹ سکتی اور ان کا اندمال اس لیے محال ہی کہ اب کوئی اُن کا جانشین مرہم رکھنے والا نظر نہیں آتا۔

ہمارے مکرم اور واجب الاحترام کرم فرما حضرت حافظ حاجی سید شاہ علی احسن صاحب احسن مارہروی مدظلہ نے جو اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں ان صدمات سے متاثر ہو کر نظم میں جن خیالات اور جذبات کا اظہار فرمایا ہی اور جس کی اشاعت کی اجازت حضور ممدوح نے نظامی پریس

کو مرحمت فرمائی ہی آج وہ مرثیہ "کسوف الشمسین" کے نام سے شائع ہوتا ہی اسی کے ساتھ اُن دونوں آفتاب و ماہتاب علم و ادب کے مختصر حالات بعض صحائف سے اقتباس کرکے ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔ بوجہ قلّتِ فرصت و عُسرِ وقت یہی مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اب تک جن سربرآوردہ اخباروں نے اُن کے حالات شائع کر دیے ہیں وہ بحرفہ یہاں نقل کر دیے جائیں۔ مرحومین کے مفصل و مکمّل تبصرے کے لیے پورا وقت اور کامل فرصت درکار ہی۔ جس کے لیے بعض عالی حوصلہ اور ذی لیاقت حضرات تیار ہو رہے ہیں۔ یہ اقتباس گویا اُن اخبارات کا یکجائی قائل ہوگا جس کی تلاش دوسرے وقت لازمی ہی۔ اور اس طرح آیندہ سوانح نویس کو بعض اخباروں کی ورق گردانی نہ کرنی پڑے گی۔ اُمید ہی کہ یہ دوسروں کے باغ سے لگائی ہوئی ڈالی ناظرین کے مطالعے کی میز پر ناموزوں نہ ہوگی۔

لختے بَرَد از دل گزرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

خاکسار

نظامی بدایونی مہتمم نظامی پریس بدایوں

۱۶ اپریل ۱۹۱۴ء

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی

فرشتہ قضا نے ہم سے اسلام کی عظمت چھین لی۔ مگر ہم بے دل نہ ہوے اس لیے کہ ہم میں اُس کی یاد تازہ رکھنے کے لیے شبلی موجود تھا۔ قرآن کی حکومت چھین لی۔ مگر ہم کو تشویش نہ ہوئی اس لیے کہ اُس کا خضر طریقت شبلی موجود تھا۔ فاروق اعظم کی سطوت چھین لی مگر ہم پر نے دلی نہ چھائی اس لیے کہ **الفاروق** کا سکّہ بٹھانے والا شبلی موجود تھا۔ مامون عباسی کی علمی برکتیں چھین لیں مگر ہم مضطر نہ ہوے اس لیے کہ **المامون** کا مصنف شبلی موجود تھا۔ امام اعظم ابو حنیفہ نعمان کوفی کا علم و فضل چھین لیا مگر ہم ناامید نہ ہوے کہ **سیرۃ النعمان** کا صورت گر شبلی موجود تھا۔ امام غزالی کے برکات و فضائل چھین لیے مگر ہم دقف یاس نہ ہوے اس لیے کہ **الغزالی** سے زمانے کا تعارف کرانے والا شبلی موجود تھا۔ مولوی روم کا فلسفہ چھین لیا مگر ہم پر اضطرار جاری نہ ہوا اس لیے کہ اُس فلسفے کا سوانح نویس شبلی موجود تھا۔ علماے اسلام کا علم کلام چھین لیا مگر ہماری ہمّت نہ ٹوٹی اس لیے کہ **الکلام** کا شارح حقیقت شبلی موجود تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی جاہ و جلالت چھن گئی مگر ہم نے حوصلہ نہ ہوے اس لیے کہ اُس کے آثار و وقار بتلانے کو شبلی موجود تھا۔ خلافت امویہ کا تمدّن چھن گیا مگر ہم نے جزع و فزع نہ کیا اس لیے کہ **الانتقاد** کا بدائع نگار شبلی موجود تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فیض مجسم

ورحمتِ عام زندگی پر اعتراضات ہو رہے تھے مگر ہم نے اعتنا نہ کی اس لیے
کہ **سیرۃ نبوی** لکھنے کے لیے شبلی کا قلم موجود تھا۔ دبیر و انیس کی
ادبی قابلیت ہم سے چھن گئی مگر ہم پر اثر نہ پڑا اس لیے کہ اُس قابلیت کا
موازنہ کرنے والا شبلی ہم میں موجود تھا بایزید کی روشن ضمیری ہم سے
چھن گئی مگر ہم نے محسوس نہ کیا اس لیے کہ شبلی ہم میں موجود تھا اس وقت
ہم صرف شبلی کے ماتم دارِ فضائل نہیں ہیں بلکہ اسلام کے سوگ دار ہیں۔
اسلامی تمدن کے سوگوار ہیں۔ عرب کے سوگوار ہیں۔ علوم عرب کے
سوگوار ہیں۔ غزالی و رازی کے سوگوار ہیں اس لیے کہ شبلی کی وجہ سے
یہ سب زندہ تھے۔ اور خدا کرے اب بھی کوئی دوسرا شبلی اُٹھے کہ ان
سب کی حیاتِ جاوید کو صدمہ نہ پہنچنے پائے۔

علامہ شبلی کی علمی زندگی اپنے تمام انوار تحقیق میں رایت افراز
سربلندی رہی۔ سب سے پہلے اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم کی لائف میں ایک مختصر عربی کتاب تالیف کی جس کا نام "**بدر الاسلام**"
ہے۔ اور جو مدرستہ العلوم علی گڑھ کے نصاب دینیات میں اب تک شامل ہے۔
مرحوم کی آخری تالیف بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہی تھی
جس کی متعدد جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ مگر ہنوز اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔
جس اس پاک زندگی کی ابتدا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی پر
ہوئی اور اُسی ذکرِ خیر پر اس کی انتہا بھی ہو گئی۔ آغازِ عمل بھی اسی نام پر ہوا
اور حسن انجام کے لیے بھی تا دمِ مرگ یہی کام تھا **ھو الاول ھو الآخر**۔

کون ہی جو اس تابناک اور درخشندہ انجام کا آرزومند نہ ہوگا کرخی و جنید کی بھی یہی ہوس تھی مگر تقدیر نے یہ خصوصیت گویا شبلی ہی کے لیے مخصوص رکھی تھی۔

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے، کہ زاہداں بہ دعا آرزو کنند

خاکِ پاک ہندوستان نے شاہ ولی اللہ جیسے محدث بھی پیدا کیے جو علم اسرار الدین کے واضع تھے۔ اسی آب و گل سے علامۂ صغانی کا بھی خمیر تھا جن کی مشارق الانوار آج تک اشراقِ سنت و منبعِ نورمانی جاتی ہی۔ قاضی عبدالمقتدر بھی یہیں کے تھے جن کے لامیۃ العجم کا آج تک اہل عرب سے بھی جواب نہ ہوسکا۔ شیخ شہاب الدین ملک العلما بھی یہیں کے تھے جن کی کتاب الارشاد شرح ملا جامی کا ماخذ تھی۔ محمد بن عبد الرحیم اصولی بھی اسی خاک سے پیدا ہوے تھے جن کو علماے شام نے علامۂ ابن تیمیہ کے مقابلے میں اپنا پیشوا مانا تھا سید مرتضی (بلگرامی) مؤلف تاج العروس بھی اسی ارض مقدس کے تھے جن کو علماے مصر اس وقت تک اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔ جوزیانی و ضیاے برنی بھی یہیں کے تھے جن کے تاریخی کمالات کا دانایانِ فرنگ تک کو اعتراف ہے۔ لیکن یہ ساری انفرادی قابلیتیں تھیں۔ جن کی جامع شاید ہی کوئی ایک شخصیت ہوی ہو۔ علامہ شبلی کی ذات میں ان تمام فضائل و برکات کو جمع کرکے قدرتِ کاملہ کو یہ ثابت کرنا تھا کہ قرآن کی یہ ہدایت

واقعہ یہی راست و درست ہے کہ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً یعنی ابراہیم ایک شخص نہ تھا ایک قوم تھا۔ اس لیے متبع دین ابراہیمی (شبلی) بھی ایک فرد نہ تھا ایک قوم تھا۔ اور ایک پوری قوم کے روشن ترین قوائے علمیہ کا جامع تھا۔ جو افسوس ہے کہ آج منتشر ہو گئے اور بڑا افسوس ہے کہ انتشار کے بعد اُن کے فنا ہو جانے کا خطرہ بھی دامن گیر ہے۔

زوالِ اندلس کی مرثیہ خوانی ابن الترندی نے کی تھی۔ سقوطِ بغداد کے مرثیہ نویس سعدی تھے لیکن اس حالتِ اضطرار میں ہم وہ علم کہاں سے لائیں۔ وہ دل و دماغ کہاں سے لائیں کہ فاجعہ شبلی کی تشریح کر سکیں جو حادثہ اندلس و بغداد سے کہیں زیادہ دردناک ہے۔ اس لیے کہ یہ شخص واحد کی وفات نہیں ہے یہ اُس قوم کی نذیرِ مرگ ہے جس کی زندگی ہمیشہ علم ہی سے قائم رہی اور وہی علم حیف ہے کہ مفقود ہو رہا ہے۔ ہم سب اس وقت مستحق تعزیت ہیں اور ہم تو کیا تمام دنیائے اسلام اس عزاداری کی ہم سے زیادہ مستحق ہے۔ لیکن مسلمان تو پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ اپنے جواہر پاروں کو ایک ایک کرکے کھوتے رہیں اور اُن کو روتے رہیں وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ یعنی اُن ثابت قدموں کو بشارت دو جنھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں۔ ہم تو اللہ ہی کے لیے ہیں اور اللہ ہی کے پاس یہاں سے پھر جانے والے ہیں۔

در علم بود کہ بے دوست نمانم ہرگز ✦ چہ تواں کرد کہ سعیِ من و دل باطل بود

سنہ ۱۳۳۲ ہجری کا خاتمہ ایک ایسے حادثے پر ہوا جو ہماری تاریخ میں مدت دراز تک حسرت و افسوس کے ساتھ یاد رہے گا۔ ۲۸-ذی حجہ کو جب سال مذکور کی زندگی میں صرف ۲۴ گھنٹے باقی تھے یہ اندوہ ناک خبر شائع ہوئی کہ آج صبح شمس العلما علامہ شبلی نے رحلت فرمائی۔ حیف کہ صبح کے وقت جو طلوع ظہور نور کا وقت ہے آفتاب علم غروب ہوگیا اور عالم علم پر ظلمت چھا گئی۔ ہماری علمی زندگی کا مدت ہوئی خاتمہ ہو چکا ہے اس لیے شاید یہ صدمہ اس قدر محسوس نہ ہو جس قدر ہونا چاہیے۔ لیکن جب ہم زندہ تھے اُس وقت اہل کمال کا ماتم بھی اس جوشِ عقیدت سے ہوتا تھا جو اُن کے کمال کی قدر شناسی میں عیاں ہوتی تھی۔ امام طبری نے وفات پائی تو تین مہینے تک لوگ دور دراز مقامات سے آکر نماز جنازہ ادا کرتے رہے۔ ماتم کی شان یہ ہے کہ رحلت کرنے والوں کے اوصاف یاد کرکے دل پر صدمہ ہو۔ صدمے سے وہ بجلی چمکے جو زندگی کا اساس ہے اس برقی روشنی میں اوصافِ بالا منزلِ مقصود دکھائیں اور اس طرح وہ موت زندوں کے لیے حیاتِ مزید کا باعث بن جائے۔

اس قحط الرجال کے زمانے میں ہم میں سے جو باکمال اُٹھ جاتا ہے اُس کی جگہ خالی پڑی رہتی ہے۔ جس طرح ایک کہنہ عمارت کا جو حصہ گرتا ہے ویرانے میں اضافہ کرتا ہے۔ پہلے کامل کی جگہ پر کامل تر بیٹھتا تھا۔ بزمِ حماد میں امام ابو حنیفہ زیب مجلس بنے۔ امام الحرمین کی مسندِ کمال امام غزالی سے آراستہ ہوئی۔ فیضی کی ملک الشعرائی کی کرسی پر طالب آملی جلوہ افروز ہوا۔

ایک عالِم کا ماتم یہ ہے کہ اُس کے کمالات کی صدا مدت تک ملک و ملت میں گونجتی رہے۔ اُس صدا سے رہروانِ شوق کو تلاش منزل میں مدد ملے۔ اُن کا نمونہ نو واردوں کے لیے شمع ہدایت بنے۔ جن شاندار اور مفید کاموں کی بنیاد اُنھوں نے ڈالی ہو اُن کی تکمیل کی جائے۔ اُن کی تصانیف، اُن کے حالات ملک میں شائع ہوں۔ تاکہ پڑھنے والے اُن کو پڑھیں اور نفع حاصل کریں۔ انسان کا ظاہر گوشت پوست ہے۔ مگر اُس کی اصل زندگی اوصاف ہیں۔ (خواہ اچھے ہوں یا بُرے) صفات کا اثر حرکات سکنات۔ رفتار گفتار۔ غرض زندگی کے ہر جلوے سے عیاں ہوتا ہے۔ ایک بدکار کی بدکاریاں ہر قول و فعل سے نمایاں ہوتی ہیں۔ کاملین کی زندگی کے ہر شعبے میں کچھ نہ کچھ کمال کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ اس لیے اہلِ کمال کے حالات کو نگاہِ تبصّر سے دیکھنا خود اپنے آپ میں آثار کمال پیدا کرنا ہے۔

علامۂ شبلی مرحوم کی زندگی میں بہت سے پہلو ایسے ہیں جو قدیم و جدید دونوں طبقوں کے علما کے واسطے سبق آموز ہو سکتے ہیں اس لیے اُن کے سوانحِ عمری اگر محنت کے ساتھ لکھے جائیں تو بے حد مفید ہوں گے۔

علامۂ شبلی کو خطرۂ ذہن ثاقب اور طبع سلیم عطا ہوئی تھی۔ اسباب ترقی استعداد یہ ہوئے کہ شفیق باپ نے پوری توجہ اُن کی تعلیم پر صرف کی۔ مولانا محمد فاروق صاحب سا اُستادِ وقت

اُستادی کو ملا - مولانا فاروق باہمہ آزادی بہت سے ایسے اوصاف
کے جامع تھے جو آج طبقۂ اساتذہ میں کم یاب ہیں - خاص جوہر یہ تھا کہ
شاگرد کے دل میں علم کا ذوق پیدا کر دیتے تھے - طلبا کو کتاب کا کیڑا نہیں
بناتے تھے بلکہ علم کا جویا اور شائق بنا دیتے تھے - فنونِ معقول و ادبیات
میں کامل ماہر تھے - اس کے ساتھ فارسی اور اُردو کے لٹریچر کا پاکیزہ مذاق
تھا - ایسے اُستاد کی تربیت نے علامۂ شبلی کے دل و دماغ میں بھی
علاوہ استعداد علم کے کاوش و ذوقِ فنونی اور انتقال ذہنی کی قوت
پیدا کر دی - علم حدیث کا استفادہ مولانا احمد علی صاحب مرحوم محدّث
سہارنپوری سے کیا تھا - فراغ تحصیل کے بعد چند روز امین دیوانی رہے -
مگر یہ ملازمت اُن کے واسطے مصیبت تھی - جس جگہ تعمیل کے واسطے
جاتے وہاں کا کھانا پینا سب حرام - آخر نہ چل سکی - نوجوانی ہی میں
علی گڑھ تشریف لائے - خان بہادر محمد کریم صاحب اُس زمانے میں
یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے - اُن کے توسل سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب
مرحوم سے ملے - مولوی صاحب ممدوح کو خداوند تعالیٰ نے جوہر شناسی
کا ملکہ بخشا تھا - کتنے آدمی اُن کی جوہر شناسی کی بدولت کیا سے کیا ہو گئے -
مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اُن کو کالج کی پروفیسری کے لیے انتخاب
کر کے سرسید احمد خاں مرحوم کے سامنے پیش کیا - یہ راستہ تھا مولوی
شبلی کے علامۂ شبلی بننے کا - عرصے تک شہر میں رہے - پھر سرسید
کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا بنگلہ لے کر آ رہے - سرسید مرحوم کو خداوند

تعالیٰ نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا جو صحیح اصول کا اخذ کرنے والا تھا۔ ذوقِ علم اُن کی رگ و پے میں ساری تھا۔ اُن کی مجلس میں علمی چرچے رہتے تھے۔ مختلف مسائل پر جرح و قدح ہوتی تھی۔ جدید و قدیم اصول باہم ٹکراتے تھے۔ بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اُس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست اُستاد کالج میں تھا۔ یہ دونوں دل دادگانِ علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف الوان نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامہ شبلی کی ذہانت اور قوتِ دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اُن پر اطمینان سے غور کیا۔ جو اصول عمدہ تھے اُن کو اخذ کیا (نہ صرف اخذ کیا بلکہ اُن کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا) نمائشی چیزوں کو رد کر دیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا اور یہ دیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آبدار موجود ہیں اگرچہ گرد آلودہ ہو کر نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں۔ اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف "پریچنگ آف اسلام" کی صورت میں عیاں ہوا۔ علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی تھی۔ علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلے کا حل کرنے والا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ سالہا سال محمڈن کالج میں رہے۔

اور بیسیوں طلبا نے اُن سے پڑھا۔ وہ محض ضابطے کے پروفیسر نہ تھے
جو بائسکوپ کی تصاویر کی طرح حرکات وصورت نمایاں کر نظر سے اوجھل
ہو جاتے ہیں۔ وہ اُستادِ شفیق اور شفقت کے اثر سے شاگردوں
کے دل میں گھر کرنے والے تھے۔ اس پر بھی اُن کے کسی شاگرد نے
اُن سے وہ فیض حاصل نہ کیا جو علامہ شبلی کے حصّے میں آیا۔ حالاں کہ
اور شاگرد بھی اُن کے خام عقل بچے نہ تھے۔ کالج کلاسوں کے طلبا تھے۔
خود علامہ شبلی سولہ برس تک کالج میں رہے۔ مگر کسی شاگرد کے قلب
میں اُن کے کمال کی وہ قدر و محبت پیدا نہ ہوئی جو اُستاد کی پیروی
پر آمادہ کرتی۔ فیض حاصل کیا تو صرف اس قدر کہ ڈگریوں کا امتحان
پاس کر لیا۔ اس میں علامہ شبلی کی کیا خصوصیت تھی۔ یہ تو ہر کالج
میں ہوتا آتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو سلسلہ تعلیم جدید کا ہمارے دیار
میں مروّج ہے اُس کا نظام و ترتیب اس قسم کی ہے جو طلبا میں شوقِ
علم پیدا کرنے سے ہمیشہ قاصر ہے۔ وہ ایک سیلاب ہے جس میں پڑ کر
طلبا اضطراری حالت میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ڈگریوں کے
ساحل پر جا پڑتے ہیں۔ کچھ خود تیرتے ہیں۔ بہت کچھ سیلاب کا زور
اُن کو بہا کر کنارے پر جا ڈالتا ہے۔ جب ساحل پر پہنچ کر آنکھیں کھولتے
ہیں تو نجات پانے پر شکریہ ادا کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ پھر اس
بحرِ ناپیدا کنار کی طرف رُخ نہ کریں گے۔ بارہ برس پڑھ کر جب ڈگری
مل جاتی ہے تو کتابوں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتے ہیں۔

اس تعلیم سے وہ قوتِ مطالعہ بھی نہیں پیدا ہوتی جو ترقیِ علم کے واسطے لازمی ہے۔

اس زمانے میں جو کام جدید سلسلے میں بھی ہوئے ہیں وہ بھی بہت کچھ تعلیم قدیم کے زیر بار احسان ہیں۔ بنگالے کی ترقی ہمیشہ راجہ رام موہن رائے آں جہانی کی ممنون رہے گی۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ عربی تعلیم کے فیض یافتہ تھے۔ سر سیّد احمد خاں مرحوم پرانے مکتب و مدرسے سے اسکول اور کالج کے میدان میں آئے تھے۔ بلگرامی خاندان کی عظمت تعلیم جدید میں مسلّم ہے۔ یہ خاندان بھی تعلیم قدیم کے آغوش شفقت میں تربیت پا کر انگریزی مدارس میں جا پہنچا تھا۔ اس بحث سے مقصود حاشا کوئی اعتراض یا الزام نہیں۔ تعلیم قدیم میں بہت سے نقائص ہیں جن کو خود علما نے تسلیم کیا ہے۔ غرض صرف اس قدر ہے کہ یہ ایک اہم مسئلہ قومی تعلیم کا ہے اور ماہروں کی توجہ کا محتاج۔

علامہ شبلی ۱۸۹۸ء تک محمڈن کالج میں رہے۔ سر سید مرحوم کی وفات کے بعد جلد کالج چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے۔ یہ نواب وقار الملک بہادر کی وزارت کا زمانہ تھا۔ سید علی بلگرامی مرحوم کی سرپرستی میں سلسلۂ آصفیہ قائم تھا۔ علامہ شبلی کے دو سو روپے ماہوار بطور وظیفہ تصنیف مقرر ہوئے۔ عرصے تک وہاں مقیم رہ کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے تقرر وظیفہ کے بعد کی جملہ تصانیف سلسلۂ آصفیہ کے عنوان سے معنون ہیں۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم کے عروج کے

زمانے میں علامہ مرحوم نے اورینٹل یونی ورسٹی کی اسکیم تیار کی۔ حال میں وظیفے میں ترقی ہو کر تین سو روپے ماہوار ہو گیا تھا۔

حیدر آباد سے واپس آکر کچھ دن تک ندوۃ العلما اور محمدن کالج کی کشمکش میں رہے۔ نواب محسن الملک مرحوم ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ کسی طرح علامہ شبلی پھر کالج میں آجائیں۔ لیکن ندوۃ العلما کی کشش غالب آئی اور وہ مستقل طور پر لکھنؤ جا کر قیام پزیر ہوئے۔

ندوۃ العلما کے ساتھ علامہ شبلی کو ابتداے قیام مجلس مذکور سے تعلق خاص تھا اور وہ اُن چند مخصوص ارکان میں تھے جنھوں نے ندوے کے مقاصد کو پوری طرح سمجھکر اُس کی کامیابی کو نصب العین قرار دیا تھا۔ مولانا سید محمد علی صاحب ناظم اول کی دوربیں اور مردم شناس نظر نے ابتدا سے یہ امر محسوس کر لیا تھا کہ ندوۃ العلما کے بعض مقاصد ایسے ہیں جن میں علامہ شبلی کی رہبری کی ہمیشہ ضرورت ہوگی۔ دارالعلوم کی اسکیم اُنھیں کے دماغ کا نتیجہ تھی۔ جو رسالہ ندوۃ العلما نے اس کے متعلق شائع کیا وہ اُنھیں کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ جب تک مولانا سید محمد علی صاحب کی نظامت رہی مختلف خیال کے ارکان اپنے اپنے دائرے میں کام کرتے رہے۔ اور باہم تصادم نہیں ہوا۔ مولانا کی علاحدگی کے بعد پھر کوئی ایسا ناظم نہ ملا جو مختلف الخیال ارکان سے کام لے سکتا۔ علامہ شبلی چوں کہ سالہا سال تک کالج میں رہے تھے ایک حد تک اُن کے خیالات آزاد تھے۔ علما کے مروجہ رسمی طریقوں کو وہ

لوازم دین نہیں خیال کرتے تھے۔ اعتراض کرنے میں بے باک تھے۔
اُن کی وسیع نظر کے سامنے متقدمین کا دور اور اُن کے آثار تھے۔ لہذا متاخرین
کے انداز کے زخم خوردہ نہ تھے۔ یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قدیم علما کو
اُن کی جانب سے شبہات تھے۔ بعض کا عرصے تک یہ خیال رہا کہ وہ
کالج کے سفیر بن کر ندوے میں آئے تھے۔ تاکہ یہاں بھی الحاد کا رنگ
جمائیں۔ خلاصہ یہ کہ آخر وقت تک علامہ شبلی قدیم طبقے کے علما میں شیر و شکر
نہ ہو سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن کی خدمات نے ندوۃ العلما کے
قالب میں ایک تازہ روح پھونکی۔ بہت سے مرحلے طے کیے۔ لیکن جو کامیابی
حاصل ہونی چاہیے تھی وہ باہمی تصادم خیالات نے حاصل نہ ہونے دی۔
ہماری بہت سی محرومیوں میں ایک یہ بھی ہے۔

رسالہ الندوہ (جو اردو کے مہتم بالشان رسالوں میں ایک رسالہ
تھا) علامہ شبلی کے قلم کے دم قدم کے ساتھ تھا۔ علامہ شبلی کے دور ایڈیٹری
میں الندوے میں جس پائے کے مضامین نکلے اُن سے اہل ذوق واقف
ہیں۔ یہ مضامین ادب اردو کے لیے بہترین سرمایۂ ناز رہیں گے۔ قیام
ندوۃ العلما سے قبل جدید و قدیم طبقے میں باہم جس قدر مغائرت اور نفرت تھی
آج اُس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ اور اب جب کہ وہ منافرت دور ہو چکی ہے
اُس کی یاد بھی خالی از ضرر نہیں۔ اس لیے ہم اُس کی تفصیل سے گریز
کرتے ہیں۔ تاہم اس قدر کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علامہ شبلی کی ذات واسطہ
تھی قدیم و جدید سوسائٹی کی صلح و آشتی کا۔ جس کی بنیاد پٹنے کے اجلاس

ندوۃ العلما میں مولانا سید محمد علی صاحب اور مولانا منور علی صاحب مرحوم سے قدیم محترم علما اور آنریبل مولوی سید شرف الدین صاحب اور آنریبل سر سید علی امام صاحب سے جدید نامور تعلیم یافتوں کے ہاتھ سے رکھی گئی۔ اس صلح اور باہمی تبادلۂ خیالات کا ثمرہ وہ بے نظیر متفقہ کوشش تھی جو مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے زمانے میں عیاں ہوئی۔ دوران قیام لکھنؤ میں علامہ شبلی نے بے حد کوشش کی کہ دار العلوم کے منصوبے کو قوت سے فعل میں لائیں۔ لیکن افسوس کہ مذکورہ بالا اختلاف نے اُن کی کوششوں کو بارآور نہ ہونے دیا۔ دونوں فریق کا زور بجائے ترقی دار العلوم میں صرف ہونے کے باہمی کسر و انکسار میں صرف ہوتا رہا۔ اگر دار العلوم نے کسی وقت ایک قدم آگے بڑھایا تو دوسرے وقت دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اگر کوئی زبردست ناظم ندوۃ العلما کو ملا ہوتا تو وہ دونوں متضاد قوتوں کو ملا کر اُسی خوبی سے کام چلاتا جیسے انجن میں آگ اور پانی کی مدد سے قوتِ رفتار پیدا کی جاتی ہے

تعلق علی گڑھ کے زمانے میں علامہ شبلی نے ممالک اسلامیہ کا سفر کیا۔ اس سفر کا ایک مقصد الفاروق کے واسطے موادِ تاریخی فراہم کرنا اور اُن کتابوں کا دیکھنا تھا جو ہندوستان میں موجود نہ تھیں۔ اس رحلت کے دلچسپ حالات سفرنامے میں شائع ہو چکے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ مراجعت کے بعد وہ خوب تن درست تھے۔ ایسی تن درستی پھر کبھی اُن کو نصیب نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد سیر کشمیر کے لیے گئے۔ افسوس ہے کہ گل گشتِ

کشمیر کا وقت بلحاظ آب وہوا موزوں انتخاب نہیں کیا گیا- جولائی، اگست کا زمانہ تھا- وہاں کے ملیریا نے سخت نقصان پہنچایا- اور صحت ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گئی- بلبل شیراز عرفی نے تو تعریف کشمیر میں یہ نواسنجی کی ہے

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

مگر بلبلِ ہند کو وہاں کے بخار نے بالکل سوختہ جاں کر دیا-

علامہ شبلی کی زندگی کا ایک سخت واقعہ پانوں کا بندوق سے اڑ جانا تھا- مردانِ جنگ آزما جس تمنا میں ساری عمر رہتے ہیں وہ اُن کو گھر بیٹھے ہاتھ آگئی- شعر العجم کی تالیف کا زمانہ تھا- شاہ نامے پر ریویو ہو رہا تھا یہ اشعار لکھکر قلم رکھا:-

بہ روزِ نبرد آں یلِ ارجمند + بہ تیغ و بہ تیر و بہ گرز و کمند
برید و درید و شکست و بہ بست + یلاں را سر و سینہ و پا و دست

زنانے میں تخت پر آکر بیٹھے- اتفاقیہ بہو کے ہاتھ سے بندوق سر ہو گئی نشانہ علامہ کا پانوں تھا- زانو کے نیچے سے قریباً سارا پانوں اُڑ گیا اہل علم کی زندگی کا ہر پہلو علمی دلچسپی کا سامان بن جاتا ہے- یہ حادثہ بھی بہت سے ادبی نکات و لطائف کا باعث ہو گیا- فارسی اور اُردو کی بیسیوں نظمیں اس کے متعلق لکھی گئیں- جن میں لنگ کے خصائص شاعرانہ لطف کے ساتھ موزوں ہوئے- سال میں ایک بار کالج میں آکر کسی اسلامی

موضوع پر لکچر دینے کا معمول کئی برس رہا۔ واقعۂ مذکور کے بعد حسبِ علی گڑھ تشریف لائے تو تاخیر حاضری کا سبب زخمِ بندوق بیان کیا۔ اور فرمایا "امید ہے کہ یہ میرا عذرِ لنگ نہ خیال کیا جائے گا۔

آخر زمانے میں ندوۃ العلما کے واقعات سے پریشان ہو کر لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن مخالفت کے تلاطم میں بھی باطمینان سیرت کی تصنیف میں مصروف تھے۔ اور فرصت کا عمدہ وقت خصوصاً صبح کا اسی کام میں صرف کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ آخر عمر میں مولوی محمد اسحاق صاحب مرحوم وکیل ہائی کورٹ سے قابل و عزیز بھائی کی وفات کا صدمہ ان کو برداشت کرنا پڑا۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ بھائی کی موت اُن کے لیے پیامِ اجل لے کر آئی۔ جو مرثیہ اس حادثے کے متعلق لکھا ہے اُس کا ہر ایک بند دل پر اثر پیدا کرنے والا ہے۔ جس دل سے یہ شعر نکلے ہیں وہ خون ہونے سے کیونکر بچ سکتا تھا۔ ایک دوسرے بھائی مہدی مرحوم کے حادثے کو یاد کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

آج افسوس کہ وہ مہرِ تاباں نہ رہا + میری جمعیّتِ خاطر کا وہ ساماں نہ رہا
اب وہ شیرازۂ اوراقِ پریشاں نہ رہا + عتبہ والدِ مرحوم کا درباں نہ رہا

گلۂ خوبیٔ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

یہ بھی اے جان یہ کوئی جانے کا ہے طور + اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور + کہ [illegible] ہو گیا کچھ اور سے اور

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

ایک بند کا آخر شعر ہے:-

اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں + ہائے افسوس میں اسحاق کہاں سے لاؤں

آخر نوجوان کے قدم بقدم پیر نے بھی سفر کیا۔ ہزاروں پیر و جوان اپنے ماتم میں نوحہ خواں چھوڑ ے۔ اسہالِ خونیں بہانۂ موت ہوئے پندرہ روز علالت کا سلسلہ رہا۔ مولوی اسحاق صاحب مرحوم نے ۵ اگست سنہ ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔ اس حادثے کے بعد علامہ شبلی اعظم گڑھ گئے کہ مرحوم بھائی کے جو منصوبے اور تجویزیں اپنے ابنائے وطن کی تعلیم و تربیت کے متعلق تھیں اُن کی تکمیل و انصرام کی کوشش کریں۔ ان منصوبوں کا پتا اُس خط سے چلتا ہے جو ۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو علامۂ مرحوم نے مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے نام بھیجا ہے:-

"عزیز مرحوم کے واقعے نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا۔ حالاں کہ مہدی مرحوم کا واقعہ اُسی درجہ کا گزر چکا تھا۔ بہر حال میں اعظم گڑھ چلا آیا۔ محمدن شبلی اسکول جو ۳۰ برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا ہائی اسکول سے مڈل اسکول تک آ گیا۔ عزیز مرحوم اس کو انٹرینس تک پہنچانا اور تمام برادری کے قصبات میں اسکول اور مکاتب قائم کرنا چاہتے تھے۔ ... مہینے کا دورہ رکھا تھا اور پانسو روپے مصارف دورہ کے لئے الگ کر دیے تھے۔

اشتہارات اور رسید بہیاں سب چھپ گئی تھیں۔

مجھکو اس کام کے علاوہ دار المصنفین اور دار التکمیل کی فکر ہی۔ ندوے میں کام کرنا ممکن نہ تھا۔ ۶ برس تک کشاکش میں گزرے جو ہوگیا وہ تعجب انگیز ہی۔ بہرحال صورت موجودہ یہ ہی کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہی جس کا کل رقبہ گیارہ بیگہ پختہ ہی۔ اس کو وقف کر رہا ہوں۔ اور شرکا بھی راضی ہوگئے ہیں۔ مسودہ لکھا جاچکا۔ رجسٹری کرانا ہی۔ دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں۔ کتب خانہ (دوبارہ) بقدر معتدبہ مہیا ہوگیا ہی اور بڑھتا جاتا ہی۔ سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہوجائے گا۔ بلکہ صرف کتب خانے کے لیے کافی ہوگا۔ دار المصنفین کی عمارت کے لیے کچھ اضافہ ہوگا۔ چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے یہ عناصر اردو کے نام سے تعمیر ہوں عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قلم کے نام کندہ ہوں۔ چندہ مشروط نہیں ہر صاحب قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ دار التکمیل کھول رہا ہوں یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے طلبا کو طیار کروں۔ دو مددگار ہوں گے انتہائی صفوں کو خود پڑھاؤں گا۔ سردست طلبائے تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہوگا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے عنوانات اور ان کے متعلق ذخیرۂ معلومات اور کتابیں اُن کو دی جائیں گی۔ جو کچھ لکھیں گے اُس کا عیب و ہنر بتایا جائے گا۔ پھر پمفلٹ۔ رسالے۔ اور پھر تصانیف کرائی جائے گی۔ وظائف تصنیفی مقرر ہوں گے۔ جو کم از کم ۲۰ - ۲۵

روپے ماہوار ہوں گے۔ دستاویز کی رجسٹری ہو جائے تو باغ کی کاٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے۔ یہ آخر عمر کا خواب ہے اور امید ہے کہ ع چوں ہنرہائے دگر موجبِ حرماں نہ شود۔ نواب عماد الملک نے دار المصنفین کی صدر انجمنی قبول کر لی ہے۔ تکمیل دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شائع ہوں گے۔ والتسلیم" شبلی

اس تحریر میں دو امر خصوصاً قابل لحاظ ہیں۔ ایک پاک اور کار آمد منصوبے۔ دوسرے یہ کہ شدتِ غم میں بھی دماغ علم کی غم خواری میں مصروف تھا۔

بعد وفات علامہ مرحوم معلوم ہوا کہ بنگلہ اور باغ از روے وصیت وقف کر دیا ہے اور بلند حوصلہ اعزہ تعمیل وصیت پر آمادہ ہیں۔ قبر اُسی باغ میں بنی ہے۔ اور وہیں تکمیل سیرت کے سامان ہو رہے ہیں ؎

شدیم خاک ولیکن ز بوے تربت ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمے خیزد

مولوی حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی تحریر فرماتے ہیں کہ علامہ مرحوم سے میری سب سے اول ملاقات اندازاً ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ آغاز تعارف اختلاف سے ہوا۔ کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ریویو لکھا۔ بعض اہم مسائل پر اعتراض کیا۔ غالباً طرف میں ایک ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا۔ یہ پہلے نیاز نامہ

شعر بھی جواب مذکور میں تھا۔

رسی آنگہ بہ دردِ ما کہ چو ما
خامہ گیری و حرف بنگاری

یہی اختلافی تعارف باعثِ ملاقات ہوا۔ ملاقات بڑھکر سرحدِ نیازمندی تک پہنچی۔ نیاز مخلصانہ محبت سے مبدل ہوا۔ اور الحمدللہ کہ وہ اخلاص علامۂ مرحوم کی رحلت تک قائم رہا۔ موت نے اخلاص میں کمی نہیں کی بلکہ حسرت کا اضافہ کر دیا۔ قریباً سی سالہ مودت کے دوران میں صدہا ملاقاتیں ہوئیں۔ بارہا پاس رہنے کا اتفاق ہوا۔ حبیب گنج بھی چند مرتبہ قدوم سے مشرف ہوا۔ ہر قسم کے مسائل پر بحث و مباحثے رہے۔

اس تمام تجربے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامۂ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے۔ اس زمانے کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے۔ اُن کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا۔ نظر میں بلندی تھی۔ مزاج میں استغنا حوصلے میں عزم تھا۔ مزاج میں نفاست تھی۔ دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں۔ لیکن دوستوں کی مروت کبھی اُن کو رسمی تملق و چاپلوسی پہ آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے روبرو نہیں رُکتے تھے مگر اُن کے پسِ پشت بیان اختلاف میں بھی اُن کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت

کرتے۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی کے ساتھ کرتے تھے اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے۔ باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کر کے اُس کو ذلیل و رسوا کرتے۔

صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی درجے کا ہو اُن کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے اُن کے کمال کی خوبیاں نظر آتیں۔ عقلی پیرایہ۔ مورخانہ انداز۔ شاعرانہ نکتہ سنجی اُن کے بیان کی رفیق و ہمدم تھی۔ جب کبھی کسی علمی مسالے پر گفتگو ہوئی بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کیے۔ فضول باتیں میں نے اُن کی زبان سے کبھی نہیں سُنیں۔

اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دل گیری کے ساتھ کیا۔ دوسرے بھائی کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی۔

احساس بہت شدید تھا۔ اس لیے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس سکھر کے زمانے میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے اُن کے پاؤں پر ڈنک مار دیا۔ اس قدر بے تاب ہوئے کہ مجھکو حیرت ہوگئی۔ اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اُس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے۔ یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا۔ ہر ذوق میں،

شدت چاہتے تھے - نمک کھانے میں تیز ہو - دستر خوان پر نمک رکھ
لیتے اور کھانے میں ڈالتے جاتے - شیرینی بھی گلوسوز مرغوب تھی -
یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھا ہوا ہے باتیں کرتے جاتے ہیں قند کے
دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں - وہ قند سے اور سامع اُن کے
کلام سے شیریں کام ہے -

سخن ہائے شیریں بہ از قند ہست

ایک مرتبہ جلسۂ ندوۃ العلما کے سلسلے میں بریلی اُن کا میرا
ساتھ ہوا اُس زمانے میں تندرست تھے - قریباً ہر اسٹیشن پر شیرینی
خریدی اور چکھی بلکہ کھائی - محض شیریں ہونا کافی تھا اُس کے حسن و
قبح سے بحث نہ تھی - پانی تیز سرد پیتے تھے - جاڑوں میں بھی یہی
ہوتا - اسی کے ساتھ سردی و گرمی بہت محسوس کرتے - ایک مرتبہ
جاڑوں میں عیب گنج تشریف لائے متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلّی
نہ ہوئی - دوسرے روز خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر
تیار کیا گیا - گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا گرم مقام پر چلے
جاتے تھے - اس سلسلے میں بمبئی کے سفر فارسی شعر و سخن کے لیے
یادگار رہیں گے - چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے - صبح کو نماز
کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے - عادت میں
سادگی تھی - لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے - غذا بہت کم
آخر آخر میں اُس کی قلت سے حیرت ہوتی تھی -

علامۂ مرحوم نے قوم کی اس قدر خدمت کی ہے کہ اگر آپ
کی یاد میں ایک ہزار صفحے بھی لکھے جائیں تو بھی کافی شکریہ ادا نہیں
ہو سکتا۔ مگر ہمیں اطمینان ہے کہ مولانا کی خدمات پبلک کی محتاج تعریف
نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کی تصانیف بجائے خود آپ کی عظیم الشان
اور پائدار یادگار ہیں۔ جن کو زمانہ ہمیشہ محفوظ رکھے گا۔ پھر بھی ہم اپنا
فرض سمجھتے ہیں کہ علامۂ مرحوم کی زندگی پر اختصار کے ساتھ نگاہ ڈالیں۔

مولانا ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک قدیم مشہور، اور
آسودہ حال خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ذی لیاقت
اور علم دوست بزرگ تھے جو عرصے تک بہ حیثیت ہائی کورٹ کے
وکیل کے قانونی پیشے میں مصروف رہے اور بعد میں آنریری مجسٹریٹ
ہو گئے۔

مولانا نے علوم مشرقی میں خاص استعداد و قابلیت
حاصل کی۔ خصوصاً تاریخ اور فلسفے سے اُن کو ابتدا سے دل چسپی
رہی۔ علوم اسلامی سے فراغت پانے کے بعد اُنھوں نے یونانی
خیالات اور جدید فلسفۂ یورپ پر نظر ڈالی۔ فرانسیسی زبان سے
بھی بعد میں کسی قدر واقفیت حاصل کر لی تھی مگر انگریزی بہت کم
جانتے تھے۔ مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ چناں چہ مولانا ایک بڑی
حد تک اپنے اُستاد آپ ہی تھے۔ تحصیل علوم کے بعد آپ نے
مختاری کا امتحان پاس کیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا کو قانون کی طرف

کس چیز نے مائل کیا۔ کیوں کہ قدرت نے اُن کی زندگی کا مقصد بہت ارفع و اعلیٰ رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے قانونی پیشے میں عملی طور پر ایک دن بھی قدم نہیں رکھا۔

مولانا ایک عرصے تک مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے پروفیسر اور الٰہ آباد یونی ورسٹی کے فیلو رہے۔ انجمن ترقی اُردو کا ابتدائی زمانہ آپ ہی کی سرپرستی میں گزرا۔ حیدر آباد میں صیغۂ تصنیف و تالیف قائم کیا۔ اور مدت تک اُس میں کام کرتے رہے۔ اسی اثنا میں جب کہ آپ حیدر آباد میں ناظم علوم و فنون تھے ایک مشرقی یونی ورسٹی کا نظام بھی مرتب کیا۔ اس کے بعد آپ نے ندوۃ العلما کی بنیاد ڈالی مگر بعد میں اندرونی پیچیدگیوں اور غلط فہمیوں کی وجہ سے مولانا نے ندوے سے استعفا دے دیا۔ کیوں کہ ندوے کے متعلق اُن کے دماغ میں جو تخیل تھا اُس کی کامیابی میں اُن کو بے حد رُکاوٹیں محسوس ہوئیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو سیرت نبوی لکھنے کے لیے وقف کر دیا۔ لیکن اُن کا قلم اس زمانے میں بھی جب کہ وہ بظاہر دوسرے قومی کاموں میں مشغول نظر آتے تھے اپنا کام بدستور کرتا رہا۔ اور سیرت نبوی کی تالیف کا خیال کرتے ہوئے یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا قلم اُن کے دمِ واپسیں تک قوم کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کی خدمت کرتا رہا۔ مولانا کی یادگار اس امر پر ہمیشہ فخر کر سکے گی کہ زندگی کا خاتمہ ایک مقدس تہرین کام کے اثنائے تکمیل میں ہوا ہو۔

لیکن اس میں شک نہیں ہی کہ اُن کے انتقال سے قوم کو ایک نا قابل تلافی نقصان ہوا ہی اور ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی ہی جس کو قوم کی کئی بہترین افراد مل کر بھی پورا نہیں کر سکیں گی۔ کیوں کہ مولانا کے انتقال سے قوم نے نہ صرف ایک فاضل ضائع کر دیا بلکہ ایک زبردست مورخ بھی کھو دیا۔ اور نہ صرف ایک زبردست مورخ ہی بلکہ آپ کے انتقال سے ایک اعلیٰ درجے کا ادیب بھی کم ہوگیا اور نہ صرف یہی بلکہ ایک نہایت فصیح البیان قومی شاعر بھی جاتا رہا اور سب سے آخر مگر سب سے مقدم قوم کا ایک عظیم الشان رُکن اور اُس کا ایک قابل احترام ہی خواہ بھی اُس کے درمیان سے غائب ہوگیا۔

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحدٍ
ولکنّہٗ بنیان قومٍ تھدّم

مولانا کی خدمات کسی ایک دائرے میں محدود نہیں ہیں، تاریخی، ادبی، مذہبی، قومی، اور حتیٰ کہ سیاسی اعتبار سے بھی اُن کی خدمات مسلّمہ ہیں۔ جن کے نام حسب ذیل ہیں:-

(۱) مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم (۲) مثنوی صبح امید (۳) المامون۔ (۴) الجزیہ (۵) سیرۃ النعمان (۶) مجموعۂ نظم (۷) سفرنامۂ مصر و روم و شام (۸) الفاروق (۹) الغزالی (۱۰) سوانح عمری مولانا روم (۱۱) فلسفۂ اسلام (۱۲) تاریخ اسلام (۱۳) الکلام (۱۴) علم الکلام (۱۵) موازنہ دبیر و انیس (۱۶) شعر العجم ۵ جلدیں (۱۷) رسائل شبلی (۱۸) جرجی زیدان پر تنقید۔

(۲۹) اورنگ زیب (۲۰) سیرۃ النبی زیر تالیف۔

تصنیف وتالیف کے میدان سے نکل کر مولانا نے علاوہ ندوے کی بنیاد ڈالنے اور حیدرآباد میں علوم وفنون کو زندہ کرنے کے قانونِ وقفِ علی الاولاد کے پاس کرانے کی تحریک وکوشش کی جو مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے علاوہ سلیف گورنمنٹ کے رزولیوشن کے بانیوں میں بھی مولانا کا نام ایک وقیع جگہ رکھتا ہے۔ گزشتہ چند سال سے وہ تمام قومی اور پولیٹکل معاملات کے متعلق اپنی رائے بلند پایہ نظموں کی شکل میں اخبارات میں شائع کراتے رہے۔ بعض نظموں کا تعلق صرف اسلامی، اخلاقی، اور تاریخ سے بھی رہا ہے۔ جنھوں نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔

مولانا کی تصانیف وتالیف کے متعلق یہاں صرف اس قدر لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا طرز بیان اس قدر سادہ مگر زوردار اور مدلّل تھا کہ وہ بہت آسانی سے اپنا ہم رائے بنانے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ اُن کی تحریر فلسفیانہ اور محققانہ طرز کی ہے۔ جس میں تاریخ وواقعات کے بجائے رنگ آمیزی کو دخل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قوم کو ایسے ہی عالموں کی ضرورت ہے جو علوم دینیہ اور علوم مشرقیہ میں ماہر ہونے کے علاوہ جدید علوم وفنون اور تحقیقات وانکشافات سے بھی پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اور ندوے سے مولانا یہی کام لینا چاہتے تھے۔

مولانا کی زندگی قدر و منزلت کے اعتبار سے کامیاب رہی ہے۔ قوم نے اُن کی قابلیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ۷۰ سال کی عمر میں ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ کی طرف سے اُن کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ حیدر آباد سے بھی مولانا کو وظیفہ ملتا تھا۔ پھر سیرت نبوی کی تالیف کے لیے حضور بیگم صاحبہ بھوپال نے بھی وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب لکھتے ہیں کہ مجھ کو اندازاً ۱۸۸۵ء میں جب میں اینگلو عربک اسکول دہلی کی جماعت مڈل میں پڑھتا اور مولانا حالی صاحب قبلہ کے ساتھ رہتا تھا پہلے پہل مولانا شبلی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جن لوگوں نے مولانا شبلی کو آخر زمانے میں دیکھا ہے وہ اُن کی اُس شباہت کا اندازہ نہیں کر سکیں گے اُس وقت اُن کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی اور چہرا گول اور بھرا ہوا تھا۔ جس سے ذہانت اور قوت کے آثار نمایاں تھے۔

دریافت کرنے پر مولانا حالی صاحب قبلہ نے فرمایا کہ یہ بہت قابل آدمی ہیں۔ غالباً ان کی مشہور نظم مثنوی صبح امید اس سے قبل شائع ہو چلی تھی۔ اکتوبر ۱۸۸۹ء سے جب کہ میں کالج میں داخل ہوا دسمبر ۱۸۹۵ء تک جب کہ میں نے کالج چھوڑا چند درمیانی وقفوں کو چھوڑ کر کمرے کے علاوہ بھی مولانا سے ہفتے میں دو چار بار ملاقات کا موقع حاصل ہوتا تھا اس کے بعد حیدر آباد اور لکھنؤ میں بھی ملاقات کے بہت سے موقعے حاصل رہے۔ اس لیے ذاتی طور پر میں مرحوم سے

خصائل کو بیان کر سکتا ہوں۔

علی گڑھ کے طلبا میں مولانا شبلی عموماً غیر ہر دل عزیز تھے۔ ان کو طلبا خشک اور مغرور سمجھتے تھے۔ لیکن یہ خیال غلط تھا۔ مولانا کی نگاہ دور رس نہ تھی اس لیے فاصلے سے طلبا کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ اور جب کوئی سلام کرتا یا سامنے سے گزرتا تو اُس کو غور سے دیکھا کرتے تھے۔ اس سے طالب علموں کو غلط فہمی ہوتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خواہ طالب علم ہو یا غیر طالب علم جو شخص اُن سے ملتا تھا وہ اُس سے جلد اور بآسانی آشنا نہیں ہوتے تھے بلکہ جس میں کوئی خاص علمی یا ادبی مذاق نہ ہوتا تھا اُس کی ملاقات سے مولانا کسی مسرت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس کے برخلاف جو علمی مباحث میں دلچسپی لیتے تھے اور اسی قسم کی گفتگو کرتے تھے اُن سے مل کر وہ بہت خوش ہوتے تھے اور جلد بے تکلف ہو جاتے تھے۔ ان کی صحبت میں غیر دلچسپ یا جاہلانہ گفتگو کو بہت کم دخل ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اُن کے ملنے والوں کا دائرہ بہت محدود رہتا تھا۔

مولانا شبلی کی زندگی میں چند باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ باوجود نہایت ضخیم کتابیں تالیف کرنے کے اور کثیر التصانیف ہونے کے وہ کسی دن بھی فلسکیپ کے دو یا تین صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ زیادہ وقت مطالعے میں اور زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ لکھنے

دیر میں اور سوچ کر مگر اُس میں کاٹ چھانٹ بہت کم ہوتی تھی۔ ہمیشہ ایک دو سطر بیچ میں چھوڑ کر کھلا کھلا لکھتے تھے۔ خط نہایت صاف اور باقاعدہ ہوتا تھا آخر عمر تک خوش نویسی کی شان اس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی اتنا بڑا مصنف حروف کی خوب صورتی کی اس قدر پروا کرتا ہو۔ ایک خاص بات اُن کی طبیعت میں یہ تھی کہ بجز تعلیم اور علمی مذاکرہ و مباحث کے اور کسی بات سے دلچسپی نہ تھی۔ غالباً ۱۷ برس کی عمر سے ۵۷ برس کی عمر تک ان کے پورے ۴۰ سال خالص علمی زندگی میں بسر ہوئے۔ یہ علمی زندگی بھی محض تقلیدی ورق گردانی نہ تھی اور نہ صرف بے کار معلومات کا دماغ میں جمع کرنا اس کا مقصد تھا۔ بلکہ وہ اس کے ذریعے روشنی اور آزادی پھیلانا چاہتے تھے۔

انسانوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو مذہبی تخیلات رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مذہب سے بالکل بے گانہ و بے پروا رہتے ہیں اور ایک آزاد دماغ رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ جن کے دماغ میں مذہب و آزادی مرکب صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس گروہ کی دو شاخیں ہیں۔ اول جن میں مذہب غالب ہے۔ دوم وہ جن میں آزادی۔ قومیت اور مدنیت کا خیال مذہب پر غالب ہے میرے خیال میں مولانا شبلی کا شمار آخری گروہ میں ہے۔ لیکن وہ آزاد خیالی مذہب ہی کے دائرے میں محدود نہ رکھتے تھے بلکہ اُس کو پالیٹکس تک پہنچاتے تھے۔ چناں چہ آخری عمر میں اُنھوں نے

اپنے پالی ٹیکل خیالات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ سر سید احمد خاں مرحوم مذہب میں کچھ کم آزاد خیال نہ تھے لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر قدامت پسند یا کنسرویٹو واقع ہوئے تھے۔ اس لیے کالج کی پروفیسری کے زمانے ہی سے مولانا شبلی کو سر سید کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی مگر یہ بات عجیب ہے کہ مولانا شبلی کی حرّیت خیال جہاں مذہب اور اپنے زمانے کے پالی ٹیکس میں حاوی تھی وہاں تاریخی معاملات میں خاص کر مطلق العنان اور جابر بادشاہوں کی تائید میں وہ مفقود ہو جاتی تھی۔ انسانی دماغ اس قسم کی متبائن رجحانات سے معمور ہے اُن کے اس میلان کی زیادہ تر یہ بھی وجہہ تھی کہ یورپین اور عیسائی مورخوں اور آریہ مناظروں نے طریقۂ اعتدال کو چھوڑ کر ہر مسلمان حکمراں پر اعتراضات کی ناروا جب سختی روا رکھی تھی اور اس بات کو عمداً نظر انداز کر دیا تھا کہ کسی قرن کے افعال کو بدنیتی کی طرف محمول کرنا ایک غیر عاقلانہ اور غیر فلسفیانہ فعل ہے۔ اس بے اعتدالی کے جواب میں مولانا شبلی بعض تاریخی مضامین و تصانیف میں اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ عموماً مسلمان بادشاہ (لہذا اُن کے عام درباری اور اہل زمانہ) نہایت مفید اور اچھے کام کرتے تھے۔ حالاں کہ اگر کل تک یہ حالت تھی تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت آج اس قدر خراب نظر آتی ہے۔ لیکن یہ رائے کا اختلاف ہے۔ مولانا شبلی کا خیال تھا کہ عالمگیر جہانگیر یا عبدالحمید خاں کی تائید سے

اصل اسلام پر الزام تک الزام کی نوبت نہیں پہنچے گی - ہمارا خیال اس
کے خلاف ہی ع ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد -

مولانا شبلی کے عزم و استقلال - محبت قومی، علمیت اور
بلند ارادوں سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا - رُپے کی محبت مولانا
کو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہوی - ان کے ارادوں میں پچھلے
دس پندرہ برس کے اندر کسی قدر تزلزل اور تلوّن کا پتا ملتا ہی - لیکن اس
تہ میں دو باتین تھیں - اول یہ کہ وہ ایک ہی مقصود کو مختلف رستوں
سے تلاش کرتے تھے - یہ جسمانی ضعف اور بیرونی حوادث کا نتیجہ تھا کہ
وہ عملی معاملات میں مزاحم مشکلات پر غالب نہ آسکتے تھے - خدا اُن
پر رحم کرے کہ وہ ہم سے ایسے وقت میں جدا ہوے ہیں جب
وہ ہمارے لیے نہایت مفید کام انجام دے رہے تھے اور دے
سکتے تھے -

مولانا شبلی نے تین اہم کام انجام دینے کی کوشش کی اور
اُن میں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی - ایک وقف علی الاولاد
کا مسئلہ جس کو پہلے بھی لوگوں نے مختلف طریقے سے چھیڑا تھا انھیں
کی کوشش سے سرسبز ہوا - دوم مولانا کی یہ کوشش تھی کہ حالاتِ زمانہ
سے باخبر روشن دماغ، اور مفید دینی عالم پیدا ہوں - اس کی بنیاد
[illegible] اور کچھ لوگ جو مولانا کے نام لیوا ہیں اور انھیں [illegible]
تحریر میں اتباع کرتے ہیں - ان میں تاریخ نویسی قومی عصبیت کے ساتھ

روحانیت کا بھی مساوی پہلو ملا تو ہم کہیں گے کہ یہ دوسری کوشش بھی
کامیاب ہوی۔ سوم وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بادشاہوں پر سے
تاریخی الزامات رفع کیے جائیں۔ ان کی نسبت ہم اوپر راے دے
چکے ہیں۔ مولانا کو اس معاملے میں بھی خاصی کامیابی ہوی۔ اگرچہ اسلام
اور مسلمین کی تاریخ کو ہم واقعاً جدا جدا سمجھتے ہیں۔ ایک شخص کی زندگی
میں ایسے عظیم الشان کارنامے اُس کو سیکڑوں برس تک زندہ رکھنے
کے لیے کافی ہیں۔

زندگی کی گوناگوں جلوہ طرازیوں اور بوقلموں مناظر کا آخری
جلوہ اور آخری منظر وہ قلیل فرصت ہی جو انسان کو اپنے لمحۂ موت سے
چند ماہ چند روز یا چند ساعت پیشتر میسر ہوتی ہی۔ انسان رہینِ عمل ہی۔
یہ عمل گو تمام زندگی کے کارنامہاے حیات سے عبارت ہی تاہم اس
فرصتِ قلیل میں جو عمل نیک و مفید صادر ہوتا ہی وہ درحقیقت انسان
کے تمام پچھلے دفترِ اعمال کا سرنامہ اور عنوان قرار پاتا ہی۔ حیات ایک
جامِ بلوریں ہی۔ اعمالِ انسانی، آبِ سائل۔ جو ممکن ہی کہ ناگوار ہو۔
ممکن ہی کہ زہرِ قاتل ہو۔ لیکن تہ میں جو جرعۂ دُرد ہی۔ اگر وہ قند و شکر
کے ریزے ہیں۔ یا آبِ حیات کے قطرے ہیں تو یقیناً آخری گھونٹ
لذت بخش ہوگا۔ اور روح پرور۔ تاریخ اعاظم برجال۔ حیاتِ جاوید
کی متاع کے لیے جو گراں قیمت پیش کر سکتے ہیں وہ اسی
فرصتِ آخریں کے چند مضروب سکّے ہوں گے۔

حضرت علامہ شبلی نعمانی اس متاعِ عالی کے لیے جو قیمت پیش کر سکے وہ اُن کے جریدۂ زندگی میں ثبت ہے۔ تاہم وہ گراں ترقیمت جو بازارِ حیات سے قدم باہر رکھنے کے چند لمحے پیشتر ادا کی جاتی ہے۔ تاریخ کا یہ فیاض دل النسان اُس کو بھی ادا کر چکا۔ ایثارِ مالی۔ خلوصِ دینی۔ جوشِ ملّی۔ کا کوئی نادر نمونہ نہ ہوگا جو اُس کے تصویر خانے میں نہ ہو۔ پھر زندگی کی آخری نمائش گاہ میں وہ تصویر بھی پیش کی جس کو زمانے کا ہاتھ یقیناً آئندہ کاشانۂ ملتِ بیضا کے سب سے نمایاں موقع پر نصب کرے گا۔

مولانا کی صحت پاشکستگی کے بعد ہی مضمحل ہو گئی تھی لیکن صرف دردِ ملت اور ذوقِ عمل کا سہارا تھا کہ باوجود اضمحلالِ طبع وہ خدمتِ علمی و دینی کے ہر بارِ گراں کے لیے اپنے دست و بازو کو تولتے تھے۔ اس پیرانہ سالی اضمحلالِ قویٰ۔ ضعفِ اعضا۔ اور افسردگیِ طبع کے باوجود وہ جواں مردانہ ہمت کے ساتھ ہر معرکے میں آگے نکل جاتے تھے۔ اس آخر عمر میں بھی جس طرح پہاڑ کھود کھود کر وہ ہیرے نکالتے تھے باعثِ رشکِ صد جوانی و شباب ہے۔

آٹھ برس ہوئے کہ ایک پاؤں ساقِ مبارک سے الگ ہو چکا تھا۔ تین سال ہوئے کہ رمضان کے روزوں میں جرجی زیدان کے تمدنِ اسلامی پر نقد لکھا جس کے لیے ضخیم مجلدات کے ہزاروں صفحے اُلٹنے پڑے آخر جب نقد ختم ہوئی تو لمعۂ بصارت بھی نذر ہو چکی تھی۔ یعنی ایک آنکھ میں پانی اُتر آیا۔ اور بے کار ہو گئی۔ چند متواتر

سالوں سے عزیزوں کی مفارقت کے داغ یکے بعد دیگرے کھا رہے تھے۔ دل و دماغ و قویٰ مختلف امراض کے نشانہ تھے۔ لیکن یہ جواں ہمت پیر مرد باوجود شکستہ پائی۔ ضعف بینائی۔ ہجوم غم۔ کثرتِ امراض نخلِ امکان کی بلند ترین شاخ کے لیے اپنے پر و بال کھول رہا تھا یعنی سیرتِ اقدس حضرت سرورِ کائنات علیہ السلام والصلاۃ کے لیے استحکام عزم کو رہا تھا آخر عزم راسخ موانع پر غالب آیا اور تدوین سیرت کا اعلان کر دیا۔ شکستہ پا مصنف ایک ایک واقع کی چھان بین کے لیے کبھی لکھنؤ ہوتا تھا اور کبھی کلکتے کے لیے بادیہ پیما۔ کبھی مطبوعات جدیدہ کی کھوج میں بمبئی پہنچتا تھا اور معاً کتبِ قدیمہ کی تلاش میں کبھی مشرق میں بانکی پور کا اور کبھی جنوب میں حیدر آباد کا رخ کرتا تھا ضعیف البصر مصنف ایک بوریے پر اس طرح آرام کرتا تھا کہ داہنے بائیں سرھانے یا پائنتی۔ کتابوں کا انبار ہوتا تھا۔ بوسیدہ اور کرم خوردہ اوراق اُس کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ صبح کے دُھندلے نور سے شام کی تاریک روشنی تک پائے نگاہ اوراقِ کہنہ کے سیکڑوں میل روزانہ سفر طے کرتے تھے۔ اور پھر نہیں تھکتے تھے۔

افسردہ دل مصنف چودہ برس سے عزیز ترین مونس (بیوی) کی امداد سے محروم تھا۔ اس سے ایک دن (قبل یا بعد) صغیر الحسن فرزند آغوش پدر سے علاحدہ ہوا۔ چند برس ہوئے دو بیٹیاں جو اس کی نسوانی تعلیم کا نمونہ تھیں نقاب پوشِ خاک ہوئیں۔ نواسا جو عزیزہ

کی یادگار تھا وہ بھی ماں کے بعد نہ رہ سکا۔ تین ماہ پہلے برادر عزیز
جو درحقیقت اُن کی زندگی کا قوت بازو تھا رخصت ہوا۔ لیکن ان
متواتر غموم وہموم کے بعد بھی جن میں سے ہر ایک انسان کے تعطّل
کار کا باعث ہو سکتا ہے وہ دین وملت کی خدمت میں طرح شاداں تھا۔
اور ہر ناوکِ غم کے بعد ایک آہ جگر دوز کھینچ کر پھر رواں جاتا تھا۔
مولانا چار پانچ سال سے ضعف معدہ۔ تبخیر۔ بول، میزر
ملیریا۔ خشکی دماغ میں مبتلا تھے۔ پوری رات رات بھر کروٹیں
بدل کر صبح کر دیتے تھے۔ لیکن صبح کو دیکھو تو وہ میز پر آسام دہ سرور کے
ساتھ مصروفِ کار نظر آتے تھے۔ ناتوان پیر سال قوی اعانت
مستقبل سے جواب دے چکے تھے شب وروز میں صرف ایک
وقت کا کھانا رہ گیا تھا جس کی مقدار ڈبل روٹی کے تین چار ٹکڑے
تھے۔ بلا قاتیوں کی مسلسل گفتگو کے بار گراں کے گھنٹے آدھ گھنٹے
سے زیادہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن ان نحیف و ناتواں قویٰ کا
پیکر غیر مادی غذا کے تناول وہضم سے کبھی سیر نہ ہوا۔ اور نہ عزیزی روح
ہمنشینانِ خلوت کے مکالمہ وتخاطب سے ایک لمحہ اُکتایا۔
ان ایام اخیرہ میں جب کہ وہ چلنے سے مجبور، آنکھوں سے
معذور یا سیرت ہائے قلبی سے ناچار تھے۔ ایک عظیم الشان اور
گراں بہا خدمتِ دینی میں مصروف تھے۔ سیرتِ اقدس کی تالیف
وترتیب کے اثنا میں مولانا کی حالت بالکل دگرگوں ہو گئی تھی۔ وہ

مجلس جو کبھی عقل و دلیل - فلسفہ و نظر کی گل بانگ سے خالی نہیں ہوتی تھی وہاں بجز نبوت و قدس و عصمت کے اب کوئی آواز نہیں اُٹھتی تھی - سیرت کی ترتیب جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی تھی - بے خودی - محویت - فنائیت ترقی کرتی جاتی تھی تا آں کہ ذکر رسولؐ کے سوا ہر ذکر منغص خاطر ہوتا تھا - صبح کے ۳ - ۴ گھنٹے تصنیف کے لیے مخصوص تھے - لیکن ان ساعاتِ متبرکہ کا سیرت کے سوا کوئی اور مستحق نہ تھا - فرمایا کرتے تھے "جس دن میں سیرت نہیں لکھتا دل میں بے چینی محسوس کرتا ہوں"

ندوہ ان کی زندگی کا مقصدِ اعظم تھا اور ان کی مسرت کا تماشا گاہ - تاہم ان ایام اخیرہ میں ندوے سے انقطاع کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ زندگی کی ہر فرصت کو صرف بارگاہ رسالت کی نذر کرنا چاہتے تھے - ۲۰ مارچ ۱۹۱۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں - "ضعف کی وجہ سے کچھ لکھا نہیں جاتا - جو کچھ بھی لکھ سکتا ہوں تو سیرت کے سوا اس قوت کے صرف کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اس لیے ندوے پر کچھ لکھ نہ سکا" ۲۱ جولائی ۱۹۱۴ء کے ایک مکتوب میں مرقوم ہے "ودبرش ان بدباطنوں سے نجات ملے گی اور دربار رسالت کا آستانہ ہوگا" ایک دوسرے خط میں تحریر ہے (۲۷ اکتوبر ۱۹۱۳ء) اب روز بروز ضعف میں ترقی کی وجہ سے ایک دن کا ناغہ بھی سخت گراں گزرتا ہے، ادھر طبیعت کی یہ حالت ہے کہ ہزار کوشش پر ہفتے میں بہت سے بہت دو تین

دن لکھ سکتا ہوں - باقی شب بیداری اور ناسازی مزاج کی نذر ہوتا ہی -
ہمیشہ آنکھوں میں دربارِ رسالت کا جلوہ تھا اور اس صحبت میں وہ لطف
محسوس کرتے تھے کہ گزشتہ تغافل پر ندامت ہوتی تھی - اکثر فرماتے
تھے ؎ اینچہ اکنوں کردم از آغاز می بالیت کرد -

عزم تھا کہ اتمام سیرت کے بعد قلم کے مسافر کو کچھ تکلیف سیاحت
نہ دی جائے گی - لیکن حیف کہ قلم کے مسافر نے دم بھی نہ لیا کہ خود
صاحب قلم نے سیاحت اختیار کی - اس غیر مدعی صاحب دل نے
خود ہی پیشین گوئی کی تھی -

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبر خاتم خدا کا شکر ہی یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اس سے دو دن پہلے کہ یہ خاتمہ بالخیر عالم میں واقع ہو - عشق رسول کا
سرشار صرف سیرت کی ناتمامی پر کفِ افسوس مل رہا تھا - وہ ایک
وسیع جائداد کا مالک تھا - وہ کنبہ رکھتا تھا - وہ فرزند محبوب رکھتا تھا
وہ برادر عزیز رکھتا تھا - لیکن نشۂ درد سے جب کبھی بیدار ہوتا تھا تو صرف
سیرت کا لفظ اُس کی زبان پر جاری رہتا تھا - اُس نے اپنی جائداد کے
لیے کوئی وصیت نہ کی - اُس نے اپنے عزیزوں کو نہیں ڈھونڈھا -
اُس نے اپنے احباب کو یاد نہیں کیا - وہ صرف اُن کو ڈھونڈھ رہا تھا
جن سے اُس کو اپنے کام کی تکمیل کا معاہدہ لینا تھا - بادۂ نبوت کے
متوالے نے آنکھیں کھولیں - شکستہ آواز سے دل شکستہ کی آواز سنائی -

سب کام چھوڑ کر سیرت پوری کر دو۔ یہی میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ غلام اپنی تمام عمر کی کمائی لے کر آقا کے پاس پہنچا۔ سیرتِ اقدس کی قدسیت و مقبولیت کا جامہ پہن کر آسمان سے اُتری تھی۔ اُس کا یہ صفحہ جب دوات کی سیاہی سے تر ہو جاتا تھا تو نور کا ہاتھ حظیرۃ القدس کے دفتر تک خود جا کر پہنچا آتا تھا۔ اسی جذبۂ قبول کی طرف مرنے سے تین سال پہلے اشارہ کیا تھا ع فرشتے ہاتھ سے میرے مثنّیٰ لیتے جاتے ہیں۔

مولانا کئی ہزار کی جائداد پر قابض تھے۔ وہ تصنیفات کی آمدنی سے کچھ پس انداز رکھتے تھے۔ وہ ایک نادر بیش قیمت کتب خانے کے مالک تھے۔ ایک پُر فضا باغ و مکان اُن کے قبضے میں تھا۔

چھٹی صدی کا ہیرو سلطانِ مصر صلاح الدین جب دنیا سے رخصت ہوا تو اُس کی ملکیت میں صرف پندرہ درم (تقریباً چار رُپے) تھے لیکن بیسویں صدی کے ہیرو نے جو مصرِ فقر و قناعت کا سلطان تھا۔ جب دنیا کو چھوڑا تو ۱۵ درم بھی اپنے بعد نہ چھوڑ گیا۔ جائداد موروثہ سے ایک حبّے کا بھی اپنی زندگی میں وہ متمتع نہ ہوا۔ بنک میں ۶ ہزار رُپے تھے۔ ایک ہزار قومی امانت ہے۔ جو قومی امین خود قوم کے سپرد کر گیا۔ پانچ ہزار سیرت کی طبع کے لیے بیٹے کو وصیت کر گیا۔ مکان باغ نسلِ قومی کے آئندہ مصنفین کو دے گیا۔ نادر کتابوں کا مجموعہ جو اس کی عمر بھر کی کمائی کا تنہا مصرف تھا تا دمِ [illegible] منتقل کر دیا۔ پچھلے دس برس کا سرمایہ دار المصنفین کے لیے وقف کر گیا۔ جیب میں

مصارف متفرقہ کے لیے جو کچھ رُپے تھے وہ نوکروں چاکروں اور مستحقین
کو اپنے ہاتھ سے دے گیا - پھر آخرت کا مسافر اس منزل سے اس طرح
دامن جھاڑ کر اُٹھا کہ اپنے بعد اپنی ملکیت کا ایک تنکا بھی نہ چھوڑ گیا - ہاں
اعمالِ غیر فانی کا گراں بار سامان البتہ اپنے ساتھ لیتا گیا - شہیدِ راہِ پیغمبر
نے حصولِ شہادت کے شوق میں ہر چیز جو اُس کے پاس تھی لٹا دی :-
دولت، جائداد، صحت، مسرت، بینائی، آزمائش گاہِ مسرت کے لیے
ہر نذر جو کام آسکتی تھی عاشقِ پاک باز نے نذر کی - ایک جان تھی،
۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اُسے بھی قربان گاہِ محبت پر چڑھا گیا -

دل و دیں باختم زیں پیش و اکنوں جاں فدا کردم
محبت را ہمیں یک وام بر من بود ادا کردم

ملّتِ مرحومہ کے زار حالی، علوم اسلامیہ کی پست پایہ گی-
قوم کا دماغی تنزل اور اخلاقی پستی، چارہ گرانِ آزارِ قومی کی نظر میں
مختلف الاسباب تھی - لیکن علامہ مرحوم کی نگاہ بار بار صرف ایک شی پہ
پڑتی تھی "علما کی بے مائگی' علما کی بے مائگی"
نصابِ کہنہ و پارینہ کا نتیجہ تھی - چوتھی صدی میں طوس کا امام (غزالیؒ)
بغداد میں جو کچھ کر گیا، ہند کا امامِ زماں چودھویں صدی میں وہی
سرزمینِ لکھنو میں کر گیا - اُس نے معقولاتِ قدیم کو دینیات کا جزو بنا دیا
تو اِس نے معقولاتِ جدیدہ کو دینیات سے ضم کر دیا - اُس کا دستِ پُر زور
جس طرح پنجہ آزمائے یونان کے لیے علم کلام قدیم کا پنجہ آہنی بنا گیا - اس کا

دستِ زورمند بھی پنجہ شکن فرنگ کے مقابل پنجۂ فولاد طیار کر گیا۔

ندوۃ العلما کی ہنگامہ آرائی صرف اسی قوت آزما کا آوازہ و شور تھا۔ جو ہندوستان کے گوشے گوشے سے فریاد بن کر نکلتا تھا۔ کبھی پہاڑ سے ٹکرایا۔ اور جواب قبول سن کر پلٹتا۔ کبھی صحرا میں گونجا اور بے صدا ہو کر پلٹ گیا۔ لیکن اس ہنگامۂ خود آرائی سے الگ اس آوازۂ نمود سے دور، اس شور نمایش سے پرے، ایک ساکن، خاموش، مخفی گھر بھی وہ ۳-۴ برس سے بنا رہا تھا۔ جس کو اگر وہ زندہ رہتا تو **خانقاہ شبلی** سے نامزد کرتا مگر آہ کہ وہ نہیں۔

اعظم گڑھ سے ملحق، اسٹیشن سے متصل، سرائے میر کی ایک قدیم شریف آبادی ہے، لیکن آبادی سے دور ایک سنسان، درختوں سے آباد میدان میں اس کی فریاد مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ پکاری، چند متاثر قلوب و نفوس اور دہقانوں کی سادہ آبادی نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ کہہ کر آگے بڑھی اور ایک متوسط الحال عربی درس گاہ کی بنیاد پڑ گئی۔ جس کا احاطہ کم از کم بیس بیگھا ہے۔ جس میں ایک عظیم الشان بورڈنگ تعمیر ہو چکا اور دار التصنیف قریب بہ تکمیل ہے۔ مسجد کی دیوار تا کمر آ چکی ہے، درس گاہ کا نقشہ پیش نظر ہے۔ اس وقت ڈیڑھ سو طالب العلم زیر تعلیم ہیں۔ آٹھ دس مدرس دیانت، خلوص، ایثار کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ نصاب جدید زیر درس ہے۔ انگریزی کا بھی ایک حد تک انتظام ہے۔

افسوس گو بانی کا چل بسا، تاہم اپنے بعد کام کرنے والوں کو

پیدا کر گیا ہے - مولانا محمد شبلی ندوی کو مولانائے مرحوم نے صرف تین دن مرنے سے پہلے، مدرسے کا مدرس اعلیٰ نامزد کیا - لیکن شاگرد کو وداع کرتے ہوئے اُستاد نے جو درحقیقت خود وداع ہو رہا تھا کیا کہا؟

"تم جہاں اور جس حال میں رہو ہمارے طریقہ تعلیم عربی کو زندہ رکھو - یعنی مقاصد ندوہ کی اشاعت تمہارا فرض ہے"

یہ وصیت وابستگانِ مرحوم کے لیے نظامِ عمل ہے - **ندوہ** جس کو وہ آخر تک نہ بھولا، اگر اس کی زمام ہمارے ہاتوں میں نہ آئی تو اہلِ ندوہ دیکھیں گے، کہ کس طرح یہ متوسط الحال درس گاہ چند روز میں خود **ندوہ** بن جاتی ہے اور اس مرحوم کی آخری وصیت جس کی صدا ہمارے کانوں میں اکثر گونجتی ہے پوری ہوگی -

نالہ زنجیرِ مجنوں ، ارغنونِ عاشقاں ست
ذوقِ آں اندازۂ گوشِ اولوالالباب نیست

مولانائے مرحوم ان اخیر سالوں میں مجالس قومی کی ہائے وہو - اور شور نشور سے اُکتا گئے تھے - ہندوستان کی حیرہ بازی اور سفاہت پسندی سے تنگ دل تھے - کبھی ارضِ مقدس حجاز کا عزم کرتے تھے کہ

گنجے گزینم و بہ پرستم خدائے را

مدینہ یونی ورسٹی کے تخیل سے لطف اندوزی اسی بنا پر تھی - کبھی خود ہندوستان کے کسی خاموش و ساکن گوشے کی تلاش کرتے تھے - جہاں "خانقاہ شبلی" یا دار المصنفین کی بنیاد ڈالی جائے - اس خانقاہ کے لیے کبھی دہلی کے خرابوں

میں کوئی جھوپڑا ڈھونڈھتے تھے۔ اور کبھی لکھنؤ کے میدانوں میں والیِ محمود آباد سے زمین کا ٹکڑا مانگتے تھے۔ آخر قرعۂ انتخاب کا پانسا مٹی کی اس چار دیواری کی قسمت میں آیا جہاں وہ زندگی میں برسوں مصروفِ جہد کار رہا۔ اور اب دو مہینے آٹھ دن سے وہاں محو آرام و خواب ہے۔ یعنی شبلی منزل، جو پہلے شبلی منزل تھی کہ وہاں وہ رہتا تھا اور اب وہ شبلی منزل ہے کہ وہاں وہ سوتا ہے۔

اس خاموش اور سنسان جھونپڑے دار المصنفین میں کیا ہوتا؟ چند قناعت گزیں، گوشہ گیر، زہد پسند، فارغ از اسباب دنیا، علم و دین کی خدمت کے لیے نور و برق کی شمعیں روشن کرتے۔ شوال ۱۳۳۲ھ ہجری اس جماعتِ مصنّفین کے افتتاح کا مہینا تھا کہ اس کا عزیز بھائی جو اس کی بنائے زندگی کا ستون تھا اس دنیا سے گزر گیا۔ اس غم و اندوہ میں جب تخفیف ہوئی تو محرم ۱۳۳۳ھ ہجری کے سال نو سے آغاز دار المصنفین کا عزم ہوا لیکن اس آغاز سے پہلے خود اس کی زندگی کے اوراق نے صفحۂ اخیر الٹ دیا۔

ان ایام آخر میں اس کا پیمانۂ دل کن جذبات سے مملو تھا؟ اس کے آئینۂ دماغ میں اب کیا کیا جلوے تھے؟ اُس کی آنکھیں اب کن تماشوں کو ڈھونڈھتی تھیں۔ ان کا جواب خود اُسی کے الفاظ میں سن لو۔ جو اُس کے خامۂ اعجاز رقم کی آخری صفت ہے "جو وقت تو یہ تھا کہ ہم چند لوگ یکجا ہو جاتے۔ اور کچھ کام کرتے۔ لیکن میری دنیا طلبی کا یہ حال ہے کہ خود بے نیاز ہو گیا ہوں۔ مگر عزیزوں کی بے تعلقی شاق ہوتی ہے۔

...... وہ بھی تعلق موجودہ پر راضی نہیں - ذرا اشارہ ہو تو میرے پاس آجائیں - لیکن میں خود روک رہا ہوں - آہ

حرؔ؎ گر تو بگذاری اے نفس طامع بسے پادشاہی کنم در گدائی "

اُن مخصوص بزرگانِ ملت میں جو گو خود مغربی تعلیم سے نا آشنا تھے لیکن قوم کے لیے وہ اس کی تحصیل فرض لازم سمجھتے تھے اور جن کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہی کہ اُنھوں نے اس تعلیم کی اہمیت قوم میں ثابت کی مولانائے مرحوم کا بھی مخصوص پایہ ہی - وہ جس طرح مذہبی علوم کی اشاعت وبقا کے لیے کوشاں تھے اُسی اہتمام کے ساتھ وہ مغربی علوم کے نشرو اشاعت میں ساعی تھے۔

تقریباً ۱۸۹۸ء میں جب کہ علی گڑھ کالج سے اُن کا ابتدائی تعلق تھا اُنھوں نے اپنی انتہائی کوشش سے اپنے وطن اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کی بنیاد ڈالی - وہ خود علی گڑھ رہتے تھے، لیکن اس اسکول کی ترقی واہتمام کے لیے اُن کا دل ہمیشہ اعظم گڑھ رہتا تھا - ان کے اس زمانے کے مکاتیب وخطوط جو احباب وطن کے نام لکھے ہیں، اسکول کے ذکر ومباحث سے پُر ہیں - اس لیے کہ قوم خود اپنے ارتفاع وتنزل کا احتساب کر سکے - سال بسال "موازنہ، ترقی قومی"، کے اجلاس منعقد کیے، اُس کی رودادیں تقسیم کرائیں -

نیشنل اسکول صرف مولانا اور ان کے احباب واعزہ کی محنت وجانفشانی کا ہی سے پرائمری اسکول سے ہائی اسکول تک پہنچ گیا،

نیشنل اسکول جب تک مولانا علی گڑھ یا اعظم گڑھ رہے برابر ترقی کرتا گیا۔ اس اثنا میں وہ حیدرآباد تشریف لے گئے یہاں سے واپس آئے تو ندوے کے خرخشوں نے اُنھیں اُلجھا لیا۔ ادھر غفلت نے اسکول کو برباد کر دیا۔ اس آخری اقامت میں جب مولانا تشریف لائے تو اسکول صرف مڈل تک رہ گیا۔ سرکاری امداد صرف چالیس پچاس رُپے تک تھی۔ بعض ناآشنایان ذوق ملّی نے نیشنل اسکول کو جارج اسکول کے نام سے بدل دیا۔ کہ شاید یہ انتساب باعث شرف وافتخار ہو سکے۔ لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ جسم جب روح سے خالی ہو تو قاقم و سنجاب کی پوشاک اُس میں زیب و آرائش نہیں پیدا کر سکتی۔

مولانا نے مرحوم صرف دو ماہ کی فرصت پا سکے۔ اس اثنا میں انھوں نے "جارج اسکول" کو "مسلم جارج اسکول" بنایا۔ اسکول کی عمارت جو بالکل ناکافی تھی، اسحاق مرحوم کے نام سے اس میں چار کمرے تیار کرائے، سرکاری امداد میں ترقی کرائی۔ ارادہ تھا کہ پھر اس کو ہائی اسکول تک پہنچا دیا جائے کہ اس اثنا میں خود ہائی کار رفیق اعلیٰ سے جا ملا۔ تعجب ہوتا تھا کہ مولانا اس ضعف پیری میں کس عزم و ہمت کے ساتھ ان مشکلات پر غالب آ رہے تھے۔

مولانا کی وفات کے بعد اُن کے پس ماندہ احباب اسکول کی ترقی و اہتمام میں پہلے سے زیادہ ساعی و کوشاں ہیں، جن میں سب سے اول قابل ذکر مرزا احمد سلیم صاحب وکیل اعظم گڑھ ہیں، مرزا صاحب

موصوف مولانا کے لڑکپن کے دوستوں میں ہیں۔ اور اعظم گڑھ کے مشہور رئیس اور ممتاز وکیل ہیں۔ مولانا کے موقوفہ باغ و بنگلہ کے متصل مرزا صاحب کا باغ ہے۔ جو کئی ہزار کی جائداد ہے۔ اس خیال سے کہ اگر مولانا زندہ ہوتے تو باغوں کے اتصال کے سبب سے اس باغ کے وقف کی بھی تحریک کرتے، مولانا کی وفات کے بعد بھی اُس وقت تک اُن کے دل نے راحت محسوس نہ کی جب تک وہ باغ کا وقف نامہ ہاتھ میں لے کر پیادہ پا کچہری سے شبلی منزل تک نہ آئے، اور خلوص و محبت کے آنسوؤں کے ساتھ کاغذ کے ٹکڑوں میں دل کے ٹکڑوں کو ملا کر مزار مبارک کے سامنے نذر پیش نہ کیا۔

سرورا! پیش تو با دیدۂ تر آمدہ ام
نگہ لطف! کہ با سوز جگر آمدہ ام

مولانائے مرحوم ہندوستانِ اسلامی کی سب سے پہلی کڑی ہیں جس نے عالم اسلام کی زنجیر اخوت سے سلسلۂ اتصال جوڑا۔ جنگ روم و روس میں بے انتہا کوشش و جانفشانی کے ساتھ اُنھوں نے رقم کثیر (چندہ) قسطنطنیہ بھیجی، با ایں ہمہ ناسزاواری، وہ اسلامی دنیا پر جان دیتے تھے۔ ایوانِ اخوت اسلامیہ کی ایک ایک اینٹ کو وہ کاشانۂ ملّت کی بنیاد سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے پچھلے انقلابات میں وہ غم و رنج کی تصویر تھے۔ جنگ طرابلس میں عربوں کے شجاعانہ کارنامے اور ترکوں کے بہادرانہ ولولے دیکھنے

تھے اور خوشی و مسرت سے جھوم جھوم جاتے تھے۔ مولوی سید سلیمان صاحب
ندوی لکھتے ہیں کہ صلح طرابلس کا زمانہ تھا۔ شب کو دس بجے تھے،
مجھے اور چند احباب کو یاد کیا، لوگ بعجلتِ تمام پہنچے، دیکھا کہ مولانا تنہا
تشریف فرما ہیں۔ مسرت کی لہریں چہرے پر نور پر دوڑ رہی ہیں،
دہنِ مبارک سے خوشی کے نعرے مستانہ وار نکل رہے ہیں، سامنے
تازہ اخبار کے نمبر پڑے ہیں۔ دوسری طرف شیرینی کا طشت ہے۔
ہم نے حیرت سے واقعہ پوچھا، فرمایا:۔
"انور بے اور دیگر ترکی افسروں نے دولت عثمانیہ کی
خدمت چھوڑ کر، طرابلس کی فوجی خدمت قبول کر لی ہے، اور حکومت
سنوسیہ طرابلس میں قائم ہو گئی ہے، خوشی سے بے قرار تھا، تنہا لطف
نہیں آتا تھا، تمھیں بھی بلا لیا"۔
علامۂ مرحوم کی موت صرف ایک شخص کی موت نہیں
بلکہ ایک خاندان کی موت ہے اور نہ صرف ایک خاندان کی
بلکہ ایک قوم کی موت ہے۔ اس لیے جہاں اور جس جگہ اُن کا
ماتم نہ ہو تعجب ہے۔ ہندوستان کے ہر گوشے میں مولانا کی
یادگار میں جلسے ہوئے اور مختلف رائیں پیش کی گئیں۔ جن میں سب
سے اعلیٰ اور ضروری یادگار سیرتِ نبوی کی تکمیل ہے جس کے
مصارف کی کفیل علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ
تاج ہند جی سی ایس آئی، جی سی آئی ای فرماں روائے

بھوپال خلد اللہ ملکہا و ظلہا علی رؤس المسلمین ہیں۔

مولانا ے مرحوم کے انتقال کے نوحے اور تاریخیں بہت ہی لکھی گئی ہیں جنکا سلسلہ ابتک اخبارات میں جاری ہے۔ لیکن ہم ایک ایسا قطعہ تاریخ جسکو خاص کسوف الشمسین کی خاطر سے حکیم کفیل الدین صاحب عالی بدایونی نے لکھا ہے نذر ناظرین کرتے ہیں۔ اس قطعہ تاریخ میں کسوف الشمسین کی خصوصیت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے یعنی ایک ہی قطعہ میں دونوں بزرگوں کی وفات کی تاریخیں بہ ترتیب زمانۂ وفات موجود ہیں۔

تاریخ وفات شمس العلماء مولانا شبلی و خواجہ حالی

(عالی بدایونی)

حالی و شبلی سے قابل نامور اہلِ قلم (شبلی) داغِ علمی دے گئے ہیں آفتابِ علم کو
۱۹ ۶ ۱۴

رونقِ میخانۂ مضمون نگاری اُٹھ گئی (حالی) رہتے ہیں احبابِ مستانِ شرابِ علم کو
۱۹ ۶ ۱۵

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

اگرچہ یہ امر مسلّم ہی (اور یقینی مسلّم ہی) کہ قوم سے ایسے افراد کا اُٹھ جانا جو نہ صرف اُس کی رونق و عزت کا باعث ہوں بلکہ قوم کو قوم بنانے میں بھی اُنھوں نے معتدبہ حصّہ لیا ہو اور پھر اُن کا اپنا کوئی جانشین بھی نہ چھوڑ جانا درحقیقت ایک ایسی عظیم مصیبت ہی جس کا کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی، تو نتیجے کے طور پر یہ امر بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جناب شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کی وفات ایک شدید قومی نقصان اور بے مثل ملّی حادثہ ہی۔ مولانا نے اُردو لٹریچر کے قالب میں ایک بالکل نئی روح پھونکی تھی اور وہ اس صدی کے مسلم الثبوت شاعر تھے۔ اُن کی اُردو نظمیں ہندوستان میں بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ اُن کی ولادت پانی پت (ضلع کرنال، پنجاب) میں ۱۸۳۷ء میں ہوئی تھی۔ اُن کی تعلیم و تربیت باقاعدہ نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ولادت کے بعد ہی اُن کے والد کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ اور ہنوز وہ نو سال ہی کی عمر میں تھے تو اُن کے والد اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ اول اُنھیں قرآن مجید حفظ کرایا گیا۔ پھر اُنھوں نے فارسی کی دو چار ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ جب فارسی

سے فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی تو اُن کو عربی کا شوق ہوا۔ مگر ابھی
کتابیں تمام نہیں ہوئی تھیں کہ اُن کے سرپرستوں اور مربیوں نے
اُن کو شادی کرنے پر مجبور کیا۔ اس وقت اُن کی عمر سترہ سال کی تھی۔
شادی ہو جانے کے بعد اُن کو سب نے اس پر آمادہ کیا کہ وہ
ملازمت تلاش کریں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا۔ اور بیوی کا
مائکا آسودہ حال تھا اس لیے وہ گھر والوں سے روپوش ہو کر دہلی
جا پہنچے۔ یہاں ڈیڑھ برس تک اُنھوں نے صرف و نحو اور منطق
کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۸۵۶ء میں اُن کو ایک قلیل تنخواہ کی اسامی
صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ مگر ۱۸۵۷ء میں جب غدر کا
ہنگامہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی بعض سخت
واقعات ظہور میں آئے تو وہ نوکری چھوڑ کر پانی پت میں چلے آئے۔
اس زمانے میں اُنھوں نے پانی پت کے مشہور فضلا سے بغیر کسی
ترتیب و انتظام کے کبھی منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھیں کبھی تفسیر
اور حدیث کا درس لیا۔ کچھ مدت کے بعد پنجاب گورنمنٹ بُک ڈپو
میں اُن کو ایک اسامی مل گئی۔ اس عہدے پر جو کام اُن کو انجام
دینا پڑا وہ یہ تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن
کی عبارت کو وہ محاورہ روزمرہ کے موافق درست کر دیا کرتے تھے۔
اس اسامی پر وہ چار برس تک رہے۔ اس کے بعد لاہور سے
اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرّسی پر بدل کر آئے۔ اثنائے مدرسی

میں وہ لاہور کے چیفس کالج میں بھی آٹھ مہینے تک اتالیق ہو کر رہے تھے۔ مگر چوں کہ یہ اسامی اُن کے مذاق کے موافق نہ تھی اس لیے پھر اپنی جگہ واپس آ گئے۔ ۱۳۰۴ھ ہجری میں جب کہ وہ اینگلو عربک اسکول کے مدرس تھے حسن اتفاق سے نواب سر آسمان جاہ مرحوم مدار المہام حیدر آباد علی گڑھ کالج کے ملاحظے کے لیے تشریف لائے۔ اس موقع پر مولانا بھی وہاں موجود تھے۔ نواب صاحب ممدوح نے بسلسلۂ امداد مصنفین ایک وظیفہ ۷۵ روپے ماہوار کا اُن کے واسطے مقرر فرما دیا۔ اس کے بعد جب مولانا سرسید کے ہمراہ بشمول ڈپوٹیشن ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم علی گڑھ حیدر آباد گئے تو نواب مدار المہام بہادر ممدوح نے اُن کے وظیفے میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے پورے سو روپے (سکہ حالی) کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور یہ وظیفہ اب تک جاری تھا۔ جس زمانے میں مولانا دہلی میں تحصیل علم کے لیے مقیم تھے وہ اکثر مرزا غالب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اور اپنے کلام کی اصلاح لیا کرتے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت کے زمانے میں جب کہ اُن کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتب وغیرہ کو درست کرنا پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُن کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرز ادا سے مناسبت پیدا ہو گئی۔ ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیمات پنجاب کے ایما سے لاہور میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہندوستان میں یہ پہلا مشاعرہ تھا

جس میں بجائے مصرع طرح کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اُس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ اس مشاعرے میں مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے جو نظمیں مختلف مضامین پر لکھی تھیں وہ بھی آج تک مشہور ہیں۔ مولانا حالی نے بھی چار مثنویاں لکھکر اس مشاعرے میں پڑھی تھیں۔ اُن مثنویوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) برکھا رُت (۲) نشاطِ امید (۳) مناظرہ رحم و انصاف (۴) حُبِّ وطن۔ یہ مثنویاں بہت زیادہ مقبول ہوئیں اور بار بار چھپ کر شائع ہوئی ہیں۔ اور اب بھی اُن کی دس گیارہ دوسری عمدہ نظموں کے ساتھ مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ میں کالج کی ڈیوٹی بُک ڈپو کے لیے نہایت اہتمام کے ساتھ چھپ رہی ہیں۔ اینگلو عربک اسکول کی مدرسی کے زمانے میں سرسید مرحوم نے اُن کو ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہو گی۔ چنانچہ اُنھوں نے اول مدّ و جزرِ اسلام لکھا جو مسدسِ حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کے بعد بھی وقتاً بعد وقتٍ و حیناً بعد حینٍ بہت سے نظم و نثر قومی مضامین لکھتے رہے۔ آپ کا سب سے بڑا اور آخری علمی کارنامہ حیاتِ جاوید (سرسید کی لائف) ہے۔ ابھی چند ماہ ہوئے کہ آپ نے اپنا نظم و نثر عربی و فارسی کلام کا مجموعہ شائع کیا تھا جو ان دونوں زبانوں پر مرحوم کی اعلیٰ درجے کی قدرت کا ثبوت ہے۔

چند سال ہوئے کہ آپ کو سرکار گورنمنٹ برطانیہ سے شمس العلما کا خطاب

ملا تھا۔ مرحوم علی گڑھ کالج کے نہایت قدیم یعنی سر سید ہی کے زمانے کے ٹرسٹی تھے۔ وہ عرصے سے علیل چلے آتے تھے جس کی وجہ سے تالیف و تصنیف کا سلسلہ بھی قطعاً مسدود تھا۔ حال میں فالج کا اثر ہوا تھا۔ مولانائے مرحوم نہایت نیک نفس، نیک طینت، باحیا، اور باوضع شخص تھے۔ باوجود نہایت آزاد رائے رکھنے کے اُس کا اظہار نہایت ملائم اور معتدل الفاظ میں کرتے تھے۔ اختلاف رائے کی حالت میں بھی اپنی جانب سے کبھی اختلاف کا دل خراش طریقہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ اور نہ اپنی تصانیف میں ایسا کرتے تھے۔ مسلمانوں سے اور علی گڑھ کالج سے اُنھیں بے حد محبت تھی۔ اُن کا علمی پایہ نہایت بلند تھا اور یہ جو کچھ تھا خود ساختہ اور سیلف اسٹڈی (ذاتی مطالعہ) کا نتیجہ تھا۔ باوجود ایک شاعر گوشہ نشین ہونے کے اُن کی واقفیت عامہ نہایت بڑھی ہوئی تھی، اور اس کا سبب خود اُنھوں نے یہ بتایا تھا کہ اُنھیں دہلی کی قدیم صحبتیں حاصل ہوئی تھیں جن کا یہ ایک خاصّہ تھا کہ اُن میں ہر مذاق اور ہر رنگ کے لوگ جمع ہوتے تھے اور جو لوگ ان صحبتوں میں شریک ہوتے تھے اُن کو ہر قسم کے خیالات معلوم کرنے کا موقع ملتا تھا۔"

انداز ۲۰ سال کی عمر میں غدر سے ۲-۳ سال پہلے مولانا دہلی میں زیرِ تعلیم تھے اُس زمانے میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خان بہادر

کی تائید میں تھا ان کے اُستاد نے پڑھکر بہت ناراضی کا اظہار کیا یہاں تک کہ اُس کو چاک کر دیا - مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا لیکن اُستاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش کے مدرسے میں پڑھاتے تھے کہا کہ رسالہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر ایک وہابی مولوی کی تائید تھی اس لیے چاک کر دیا گیا - مولانا کے اعتدال و انصاف کی یہ سب سے پہلی مثال ہے -

مولانا کی تصانیف کا جہاں تک پتا چلا ہے چھپی ہوئی کتابوں میں سب سے پہلے ایک خاص ضخیم کتاب تریاقِ مسموم مذہبی مناظرے میں ہے جس میں پادری عمادالدین کی کتاب ہدایت المسلمین کا جواب نہایت شائستگی و متانت سے دیا گیا تھا - افسوس ہے کہ یہ کتاب مفقود ہے - غالباً مولانا نے ۱۸۶۸ء سے پہلے یہ تصنیف کی تھی - مولانا کا ایک رسالہ پادری عمادالدین کی تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے - اس سے تین چار برس بعد کی تصنیف ہوگا - اور غالباً مولوی غلام الحسنین صاحب کے کتب خانے میں اس کی کاپی موجود ہے - اور کہیں نہیں ملتا - اس میں پادریوں کی اور فلسفی اور غیر متعصب یورپین کی رائے کا مقابلہ آں حضرت صلعم کے متعلق نہایت تحمل سے کیا گیا ہے - لاہور کے زمانۂ قیام میں مولانا نے ایک کتاب مجالس النساء عورتوں کی تعلیم کے لیے قصے کے پیرائے میں لکھی تھی - اس کتاب پر کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے بمقام دہلی ایک ایجوکیشنل دربار میں لارڈ نارتھ بروک سے

ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور ایک مدت تک اودھ و پنجاب کے مدارس نسواں میں جاری رہی۔ عبارت نہایت سلیس ہے۔ مابعد کی تصانیف جنھوں نے ہندوستان بلکہ ایشیا کے ادب اور اعلیٰ اور پاک طرز تحریر کے لحاظ سے انقلابِ عظیم پیدا کیا مشہور انام ہیں اور مولانا ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُن کی زندگی میں مسدس حالی کا ترجمہ پشتو اور سندھی میں، مناجات بیوہ کا ترجمہ علاوہ دس زبانوں کے اعلیٰ سنسکرت میں، رباعیاتِ حالی کا ترجمہ انگریزی میں اہل زبان نے کیا ہے۔ مولانا کی تصانیف باعتبار زمانۂ تصانیف مفصلۂ ذیل ہیں۔ مثنوی تعصب و انصاف۔ مثنوی رحم و انصاف۔ مثنوی کلمۃ الحق۔ ۱۸۷۴ء میں یا اُس کے قریب۔ مسدس حالی ۱۸۷۹ء میں۔ یہ کتاب نئے اور اعلیٰ اور مسلمانوں کے ترقی پزیر خیالات کی بائبل سمجھی جاسکتی ہے۔ اور جب تک مسلمان بہت اعلیٰ ترقی نہ کریں وہ ہمیشہ مقبول رہے گی۔ سوانح عمری حکیم ناصر خسرو علوی بلخی۔ اعلیٰ درجے کی فارسی سوانح عمری ہے۔ جس کے ساتھ حکیم موصوف کا سفر نامہ بھی ہے۔ اندازاً ۱۸۸۳ء میں شائع ہوی۔ حیاتِ سعدی جدید قسم کی سوانح عمری کی بنیاد مشرق کے ادب میں اس کتاب نے ڈالی ہے۔ اندازاً ۱۸۸۶ء میں شائع ہوی۔ مقدمہ شعر و شاعری مع دیوانِ حالی ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اب دستیاب کم ہوتا ہے۔ بلحاظ نقادی۔ شاعری اور اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات شاعرانہ

کے یہ کہنا بلا مبالغہ ہی کہ خود ہی اپنی نظیر ہی۔ بعض جدید غزلیں سطحی نظر والوں کو خشک معلوم ہوتی ہیں مگر اعلیٰ فلسفے اور اخلاق سے مملو ہیں۔ ٹینی سن اس سے بہتر نہیں دکھا سکتا۔ ایڈیشن رقعات نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مع نمونہ نثر فارسی مولانا مرحوم۔ اپنے مرحوم استاد اور محسن کی یادگار کے طور پر چھپوایا ہی۔ اس کو مولانا کی تصنیف میں شمار نہ کرنا چاہیے مگر مولانا کے کاموں اور محنتوں میں اس کا شمار ضرور ہی۔ یادگار غالب۔ نہایت دلچسپ اعلیٰ درجے کی مفصل تنقیدی اور تعریفی سوانح عمری اُن کے آخری اُستادِ شعر نواب اسد اللہ خاں غالب کی ہی اور مشہور کتاب ہی جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی۔ شکوۂ ہند۔ مشہور ترکیب بند ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ مثنوی مناجات بیوہ۔ یہ شکوۂ ہند اور یادگار غالب کے درمیانی زمانے میں شائع ہوئی اور بلحاظ قوت۔ درد۔ اور خالص ہندی نظم کے مولانا کی بہترین تصانیف میں ہی۔ حیاتِ جاوید۔ تقریباً ایک ہزار صفحے کی سرسید احمد خاں کی نہایت اعلیٰ درجہ کی سوانح عمری ہی جس کے پڑھنے سے اکثر مباحث اور مطالب جو مسلمانوں کی تمدنی مذہبی۔ اخلاقی۔ اور تعلیمی معاملات سے متعلق ہیں حل ہوتے ہیں۔

---

[۱] مولانا حالی نے ضمیمہ اُردو کلیات نظم حالی کے دیباچہ میں اپنے اور نواب صاحب مرحوم کے تعلقات کا حال اس طرح تحریر فرمایا ہی "حسنِ اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں میرا تعلق جناب

غفراں مآب نواب محمد مصطفےٰ خاں صاحب مرحوم و مغفور رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کی سرکار میں جو کہ فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے - ہو گیا - اور اس تعلق کی وجہ سے تقریباً آٹھ نو برس اُن کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا - چونکہ جناب ممدوح کا قیام ۱۸۵۷ء کے بعد زیادہ تر جہانگیر آباد میں رہنے لگا تھا - جہاں مخاطب صحیح کمیاب تھا - اس لیے وہ فکر شعر کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے - لیکن راقم وہاں رہنے لگا تو رفتہ رفتہ جناب ممدوح کا شوق از سرِ نو تازہ ہو گیا - اگرچہ اُس وقت تک مجھکو فارسی یا اُردو میں فکر شعر کرنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا - مگر جناب ممدوح کو ادھر متوجہ دیکھکر میرے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی -

فارسی یا اُردو کی جس زمین میں وہ غزل لکھتے مجھے بھی اپنے ساتھ شریک فرماتے - انھیں دنوں میں تنہائی اور قلتِ مشاغل کے سبب عربی ادب کی ہوس بھی لیں چٹکیاں لینے لگی - اگرچہ علم ادب کسی اُستاد سے باقاعدہ پڑھنے کا کبھی اتفاق نہوا تھا - اور نہ کسی ادیب سے اصلاح لینے کا موقع ملا تھا - مگر چونکہ لٹریچر سے فی الجملہ مناسبت تھی کبھی کبھی ڈکشنریوں کی مدد سے ادب کی آسان آسان کتابیں دیکھنے لگا - رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ عربی نظم و نثر پر خود و بتدریج کی طرح ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہوئی - غرضکہ فارسی اور اُردو کے ساتھ عربی نظم و نثر میں بھی چند مدت خامہ فرسائی کرتا رہا - آخر وہ زمانہ آپہنچا کہ فارسی اور عربی کے مخاطب صحیح تمام ملک میں نایاب ہو گئے اور دونوں زبانیں ہندوستان کی مُردہ زبانوں میں شامل ہونے کے قابل ہو گئیں ۔

مجموعہ چھپوایا گیا تھا۔ جس کی تعداد شاید اب بڑھ گئی ہے۔ مضامین حالی۔ مولوی سید وحیدالدین صاحب سلیم نے مولانا کے نثر مضامین اخباروں اور تہذیب الاخلاق سے لے کر سنہ ۱۸۹۴ء کے قریب تین چار سو صفحات پر چھپوائے تھے اب غالباً نہیں ملتے۔ مجموعہ نظم فارسی (ضمیمہ کلیات اُردو) آخر عمر میں مولانا کی خواہش تھی کہ اپنی اُردو کلیات مرتّب کر کے چھپوائیں۔ افسوس ہے کہ بیماری نے کام مکمل نہ ہونے دیا۔ لیکن اس قدر کامیابی ہوی کہ زبان بند ہونے کے چند روز قبل ہی مولانا کا فارسی اور عربی[۱] مجموعہ پریس میں جا چکا تھا۔

مولانا حالی کی نثر میں خصوصیت یہ ہے کہ معنی اور الفاظ بالکل برابر برابر ہیں۔ کلام میں کہیں اہمال یا اشکال نہیں۔ لفظاً البتہ بعض جگہ مشکل ہیں۔ تنقید اور رائے کے لیے اس سے بہتر طریقۂ ادا اس زمانے میں نہیں ہو سکتا۔ سلاست کلام میں سرسید کا درجہ مولانا حالی مرحوم سے بہت زیادہ ہے۔ بامحاورہ اور دلچسپ عبارت لکھنے میں پروفیسر آزاد یقینی بالا ہیں۔ مگر جو فلسفی عمق حالی میں ہے آزاد میں اُس کا پتہ نہیں۔ اور لٹریچر کے جن رموز پر حالی پہنچے ہیں سرسید مرحوم وہاں تک نہیں پہنچ سکے۔ مولانا حالی کے مضامین

---

[۱] مولانا نے عربی نظم۔ نثر کے لکھنے کی ابتدا کس طرح کی اس کا ذکر مولانا مرحوم نے اسی مجموعہ کے دیباچہ میں کیا ہے ملاحظہ ہو نوٹ صفحہ ۱۰۸

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا دل ایک ایسا شفاف اور پاک دریا ہے جو نہایت صفائی سے بہ رہا ہے۔ جس میں کدورت و غبار بالکل نہیں ہے اور جن کے کلام سے ہر قسم کے ادبی اور اخلاقی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں مگر کسی قسم کی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی۔

مولانا کی نظم کے متعلق رائے دینا ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں اور وہ رائے مبالغے سے خالی نہ سمجھی جائے گی۔ اُن کا شمار دراصل جس طبقے میں ہے وہ شاعروں سے بہت بالا ہے یعنی حکما و معلمین اخلاق اور مصلحین اقوام میں۔ صرف ایک شاعر سے اُن کو مثال دے سکتے ہیں۔ یعنی سعدی علیہ الرحمہ سے۔ لیکن سعدی کے کلام میں جہاں فطرت انسانی کی واقفیت بہت زیادہ ہے وہاں یہ عیب بھی ہے کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں۔ اور وہ ایسی باتیں ہیں جو عورتوں اور بچوں کو نہیں پڑھائی جا سکتیں۔ مولانا حالی کے ہاں یہ بات نہیں۔ سعدی ایک کامل شخص ہیں مگر وہ انسان کو کامل بنانا چاہتے تھے۔ حالی کامل شخص ہیں مگر وہ قوم کو کامل بنانا چاہتے ہیں۔ جب درسیات میں حالی کا کلام پڑھایا جانے لگے گا اُس وقت اُس کے فوائد معلوم ہونگے۔

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے اور جو لوگ مولانا سے واقف ہیں وہ اس کی پوری تائید کریں گے کہ مولانا یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیہ خیالات کی رو سے ایک

صاحب باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی بُرائی اُن کی زبان سے نہیں سُنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔ عزیزوں سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ غریبوں کی امداد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ مذہباً نہایت بے تعصب تھے۔ اُن کے والدین شیعہ تھے اور مرحوم کو یتیم چھوڑ کر والد ماجد انتقال کر گئے تھے۔ بچپن میں مذہب اہل سنت میں تعلیم پائی۔ لیکن وہ اگر شیعوں کی طرح تعلیم پاتے تو بھی ایسے ہی اعلیٰ خیال اور بے تعصب اور خیر خواہ اسلام شیعہ ہوتے۔ جیسے اب بلند خیال۔ بے نفس۔ محبِّ اہل بیت۔ اور صوفی منش سنّی تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی اختلاف کو وہ نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ اور طریقۂ نماز کے علاوہ اور کسی طرح اس اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کی اولاد اور خاندان میں دونوں طریقے کے لوگ موجود ہیں۔ اور وہ کسی کو یہ نہ کہتے تھے کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ اُن کے پاس بیٹھنے اور باتیں سننے سے نہایت بدباطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ مرحوم کا انتقال دو دن کے کرب کے بعد قرآن شریف اور ادعیہ سنتے سنتے یکایک ہو گیا۔

قرآن شریف میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہی اِعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ یعنی عدل یا میانہ روی اختیار کرو۔ یہ بات تقوے سے قریب تر ہی۔ یہی عدل و میانہ روی مولانا کی خاص صفت تھی۔ اُس کے ساتھ رحم و مروت۔ پانی پت بلکہ اس تمام

علاقے کو فخر ہو سکتا ہی - کہ ایسا انسانِ کامل اُس میں پیدا ہوا جس نے خود کو کبھی غیر معمولی آدمی بھی نہ سمجھا - اخلاق میں عادات میں - برتاؤ میں مروت میں فیاضی میں اعلیٰ درجے کا اعتدال تھا - عزیزوں اور اولاد کی محبت - تعلیم کا خیال - عالم کی خیر خواہی - نیک آدمیوں کی قدر دانی میں اُن کی مثال ضرور ملے گی مگر نہایت کم - آخر زمانے میں جب کہ دماغ بے کار ہو گیا تھا - اور لوگ اپنی عادات کے موافق مختلف خیالات سے جنگ کی خبروں کا ذکر کرتے تھے - تو مولانا مرحوم جب بہت سے آدمیوں کے مقتول و زخمی ہونے کا ذکر سنتے تھے تو اس قدر تاسّف سے آہ کرتے تھے گویا خود اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہی - خدمتگار اُن کو الگ روتے ہیں کہ ایسا آقا دیکھا نہ تھا - یہی حالت رشتہ داروں اور اہل شہر کی ہی قوم میں بھی کچھ کم افسوس نہ ہوگا -

مولانا کے استغنا اور سچی قناعت کی ایک بیّن مثال یہ ہی کہ مولانا جب عربک اسکول دہلی میں ملازم تھے اُس زمانے میں سر آسمان جاہ حیدر آباد کے مدار المہام تھے - اور اُن کی مدار المہامی کے زمانے میں نواب وقار الملک کا دور دورہ تھا - چناں چہ نواب وقار الملک بہادر کی تحریک سے نواب سر آسمان جاہ بہادر نے ریاست سے سو رُپے ماہوار کا وظیفہ مولانا حالی کے لیے مقرر کر دیا - باوجودے کہ مولانا کو جائداد نہیں ملی اور حالی سکّے کے

سو رُپے جو انگریزی سکے کے اسّی رُپے ماہوار کے قریب ہوتے ہیں کوی بڑی رقم نہ تھی لیکن اُنھوں نے اپنی گزر اوقات کے لیے حالی سکّہ کے سو رُپے ماہوار کافی سمجھ کر عرباب اسکول کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔

سالار جنگ اول مدارالمہام حیدرآباد دکن کی فیاضی اور مردم شناسی کے ساتھ قدرافزائیاں مشہور عالم ہیں۔ سرسید کا اُن پر پورا اثر تھا اور جس کسی کی نسبت سرسید سفارش کرتے اُسی کو حیدرآباد میں عمدہ جگہ مل جاتی تھی۔ اگر مولانا حالی جھوٹوں بھی اشارہ کرتے تو یقیناً اُنھیں حیدرآباد میں اعلیٰ درجے کا عہدہ مل جاتا لیکن اُن کی غیور طبیعت نے اسے جائز نہ سمجھا کہ وہ اپنے لیے خود اس قسم کی کوی تحریک کرتے۔ محمدن کالج میں فارسی کی پروفیسری ملنا بھی کوی دشوار امر نہ تھا لیکن اُنھوں نے اس کو بھی پسند نہیں کیا کہ وہ اس کے لیے کوشش کرتے بلکہ اپنی ذات کو قوم کے لیے زیادہ مفید بنانے کی غرض سے آزاد رہ کر قومی خدمت کو زیادہ مناسب سمجھا۔

خدمت قوم کے مختلف طریقے ہیں۔ بعض طریقوں میں فائدہ کم اور شور و غل زیادہ ہوتا ہے۔ بعض میں شور و غل بالکل مفقود اور فائدہ بہت۔ جذبات قومی کا احساس طبیعت کی مناسبت دیکھکر خادمانِ قوم کو اپنا راستہ آپ ہی بتا دیتا ہے۔ واعظ وعظ کہکر، لیکچرار تقریر کرکے۔ شاعر نظم لکھکر۔ اور انجمن ساز انجمنیں اور سوسائٹیاں بناکر اپنے حوصلے

اور لبساط کے موافق جس طرح اور جس صورت سے ممکن ہو سکتا ہی اُس حقیقی اور سچّے درد کے ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو اُن کے اعضاے جسمانی اور دل و دماغ میں دن رات تلاطم برپا رکھتا ہی۔

مولانا حالی مرحوم صرف شاعر کامل، نا نژبے بدل اور تصانیف کے سرمایہ دار ہی نہ تھے بلکہ جن دماغی کوششوں سے اُنھوں نے قوم کی خدمت کی اور مسلمانوں کو جس ٹیڑھے رستے سے ہٹا کر راہِ راست پر ڈالنا چاہا اُس کا بہترین نمونہ اُن کا مسدس مدوجزر ہی۔ بغیر کسی شور و غل کے (نام و نمود کے خادمانِ قوم سے الگ رہ کر) قوم کی ایسی خدمت انجام دینی جو صدیوں اور قرنوں تک اپنا اثر دکھاے اُن کی نیک نیتی سچے احساس اور دردمند ہونے کی دلیل ہی۔ نثر میں اُس کا دیباچہ پڑھیے۔ قوم کی تباہ حالت پر نظر ڈالیے۔ زمانے کی ضرورتوں کو دیکھیے اور دل میں غور کیجیے کہ ہم کیا تھے، کیا ہو گئے۔ اور آیندہ ہم میں کیا باقی رہے گا۔ اگر اختصار مدّ نظر نہ ہوتا تو یہاں نثر کا بڑا حصہ اور نظم کے بہت سے اشعار نقل کیے جاتے۔ مگر چوں کہ اس وقت صرف اُن کی خدمات قومی اور مسدس سے بحث ہی اس لیے دیباچہ نثر سے صرف چند سطریں اور نظم کے دو چار اشعار پر اکتفا کی جاتی ہی۔

قوم کی حالت تباہ ہی۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہی۔ دین کا صرف نام باقی ہی۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہی۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہی۔ اخلاق بالکل بگڑ

گئے ہیں اور بگڑے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ اُمرا جو قوم کو کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت کچھ دخل ہے زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں۔ اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے اور لکھ رہے ہیں۔ مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کے بیدار کرنے کے لیے ابھی تک کسی نے نہیں لکھی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس سے ہوگا مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر دو طرح کے خیالات گزرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا۔ اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ سرسید کی پالیسی پر کھلم کھلا مخالفت کا اظہار کر رہے تھے اور اُن کے قول و فعل پر علانیہ طعن و تشنیع اور نکتہ چینیاں کی جاتی تھیں۔ حالی نے اُسی پُرآشوب وقت میں

اُس جواں مرد اور شیر دل ناصح مشفق (سر سید) کا کہنا پورا کیا۔ پُرانی شاعری سے بچ کر ایک مسدس کی بنیاد ڈالی اور اپنا فرض پورا کر دکھایا۔ اولاً پانچ سات بند تمہیدیہ لکھے پھر عرب کے زمانۂ جاہلیت کا بدل جانا دکھایا ہے۔ آں حضرت کا وفات فرمانا اور اسلام کو ایک سرسبز و شاداب پودا چھوڑ جانے کی تصویر کھینچی۔ تنزل کا دور شروع ہوا۔ دلوں میں تعصب۔ غرور۔ حسد۔ خود غرضی حرص ولالچ پیدا ہونے لگا۔ اور بربادی کی گھٹائیں چھا گئیں۔

عرب کا زمانۂ جاہلیت کا نقشہ ۱۳۔ ۱۴۔ بند کا سرمایہ ہے۔ یہاں صرف اُس کے پہلے بند پر قناعت کی جاتی ہے۔

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا ۔ جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانے سے پیوند اس کا جدا تھا ۔ نہ کشورستاں تھا نہ کشور کشا تھا

تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیدائش ملاحظہ ہو۔

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت ۔ بڑھا جانب بو قبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت ۔ چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

افلاس کا کیا سچا خاکا کھینچا ہے۔

یہ اے قومِ اسلام عبرت کی جا ہی | کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہی
بجسے سنیے افلاس میں مبتلا ہی | جسے دیکھیے مفلس و بے نوا ہی

نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل
اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

ایک دوسرے کے کام آؤ اور آپس میں محبت کرو۔

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدا کا | کہ ہی ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہی خالقِ دوسرا کا | خلائق سے ہی جس کو رشتہ ولا کا

یہی ہی عبادت یہی دین وایماں
کہ کام آے دنیا میں انساں کے انساں

مسدس شائع ہونے کے بعد اس پر جو اعتراضات کیے گئے اور اسی بحر اسی زمین اسی طرز پر جو دوسرے مسدس مخالفین نے لکھے اُن سب کا مجموعہ ان مختصر اوراق کے زائل کرنے کو کافی تھا لیکن اس مسدس کی بڑی شہرت معترضین کا علانیہ اظہار مخالفت ہی ثابت ہوا۔ لوگوں نے اسے منگایا۔ پڑھا خوش اقبالی پر ہنسے بدبختی پر آنسو بہاے نتیجہ یہ ہوا کہ راس کماری سے کشمیر اور پشاور سے کلکتے تک اس کی دھوم مچ گئی۔ بیسیوں اڈیشن نکلے سیکڑوں انشا پردازوں نے ان اشعار سے اپنے مضامین میں مدد لی۔ واعظوں نے وعظ میں ان بندوں کو پڑھا اور مولود خوانوں نے اپنی یادو داشتوں میں اُن کو نقل کیا۔ اگرچہ مرحوم کی بیشتر نظمیں

اور مضامین قومی رنگ میں رنگے ہوے ہیں اور ان کا ایک
ایک لفظ اہل بصیرت کے لیے پند و نصائح کا لب لباب ہی لیکن
اگر وہ کچھ نہ لکھتے اور ان کی زندگی کا سرمایہ صرف یہ مسدس ہی شمار
کیا جاتا تو بھی وہ ایک بڑے شاعر ایک سچے قوم کے خادم اور خادمان
قوم کی صف اول میں بیٹھنے کے قابل تھے -

مرنے والا مر گیا - اس نے حیات جاوید پائی اور دور
حیات کی منزلیں اس نے جس استقلال اور ثابت قدمی سے طے کیں
اس کی روشنی اس کے کلام کو تا ابد چمکانے کے لیے کافی ہے -

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہی گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

فقط

(مرثیہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رخصت اے صبر! کہ بس جی کی اب تاب نہیں
طبع بے عیش نہیں آرزوئے خواب نہیں

جمع کیا کیا غم واندوہ کے اسباب نہیں
دلِ مضطر نہیں یا دیدۂ خوں ناب نہیں

خانۂ عیش میں بربادی و ویرانی ہے
آج مجموعۂ خاطر کی پریشانی ہے

عقل و ادراک ہیں گم جمع نہیں ہوش و حواس
وحشت اٹھتی ہے جو بیٹھے کوئی غمخوار بھی پاس

دلِ مایوس پہ ہیں قبضہ کیے خوف و ہراس
کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے بجز حسرت و یاس

خاک اب رہ کے زمانے میں کوئی سیر کرے
کہ برے دن نظر آتے ہیں خدا خیر کرے

کوئی سامانِ فراغت نہیں حسبِ دل خواہ
گھر ہے ویران تو گھر والے ہیں برباد و تباہ

اس طرف ملک میں ہے قحط و وبا شام و پگاہ
اُس طرف قوم میں فقدانِ کمال آہ صد آہ

جب سے خوش بختی و اقبال نے منہ پھیرا ہے
ہر طرف سے غم و ادبار نے آ گھیرا ہے

آج سے چند صدی قبل کی نسبت ۔۔۔ نہ یہ ادبار کا نقشہ تھا نہ غم کی صورت
کال تھا عیش کا تھی ہنج کی بڑھتی دولت ۔۔۔ اور پھر علم و کمالات کی شان و شوکت

کوئی مفلس نظر آتا تھا نہ جاہل کوئی
تھا نہ اس عہد کا بے فکر بھی کاہل کوئی

اصفہان و عربستان کا ہو کیا ذکر یہاں ۔۔۔ کہ پسندیدہ و مرغوب نہیں طول بیاں
خطۂ ہند جسے کہتے ہیں فردوس نشاں ۔۔۔ اس کے حالات ہی سنیے تو یہ ہو جائے عیاں

سات دن بام ترقی پہ چڑھے رہتے تھے
کیا زمانہ تھا کہ ہم سب سے بڑھے رہتے تھے

اولیا و صلحا و عرفا و امرا ۔۔۔ فقہا و علما و فضلا و وزرا
حکما و فصحا و بلغا و شعرا ۔۔۔ اتقیا و کملا و رؤسا و فقرا

یہ سب، اور ان کے سوا پیشہ ور و اہل ہنر
ملک میں پھیلے تھے یوں جیسے فلک پر اختر

فارغ البال تھے اس عہد میں سب اہل کمال ۔۔۔ آب و خور کی نہ گرانی تھی نہ تھا قحط رجال
۔۔۔ نظر آتا تھا نہایت خوش حال ۔۔۔ عیش و عشرت کے سوا پاس نہ تھا رنج و ملال

با کمالوں کی یہ کثرت تھی زمانے بھر میں
جمع ہو جاتے تھے دس بیس کبھی ایک گھر میں

اس تعین کو سمجھے نہ غلو شاعر — بے تکلف ہے آئیں گے جو ہوں گے ماہر
واقعاتِ متواتر سے ہوں کیوں کر منکر — دیکھ سکتے ہیں تواریخ کو اب بھی ناظر

اس صدی میں کملا و فضلا تھے جتنے
عمر بھر اب نظر آئیں گے نہ یکجا اتنے

اکبری عہد کی تاریخ ہی دیکھیں ہم اگر — سیکڑوں آئیں نظر اہلِ کمال اہلِ ہنر
جن کا اس وقت میں ثانی تھا نہ کوئی ہمسر — فرد فرد اپنے کمالات میں تھی نام آور

دھوم تھی ہند سے ایران و عرب تک سب کی
جب تو جب عزت و توقیر ہی اب تک سب کی

جب ہوا عالمِ ایجاد میں اکبر پیدا — جلوہ گر نو سو انچاس سنِ ہجری تھا
سو برس تک ہو جو اس سال سے حصرِ کملا — ایک مجموعہ طومار ہو فہرست ہو کیا

ڈالیے ذیل کے ناموں پہ نظر بالاجمال
کہ فقط ایک صدی میں ہیں یہ اصحابِ کمال

ملک بھر کے کملا کا تو ہی دشوار شمار — ایک کوزے میں سماتا نہیں بحرِ ذخار
ہی مناسب کہ نمونے کے لیے ہوں اظہار — صرف وہ نام جو تھے زینتِ شاہی دربار

صورتِ ترجمہ اسلاف کی تحریریں ہیں
اکبری عہدِ جہانگیر کی تصویریں ہیں

خانِ خاناں[۱] و ابو الفضل[۲] و ضمیری[۳] عرفی[۴] | دکنی خواجہ خداوند[۵] و صبوحی[۶] فیضی[۷]
میرزا جعفر[۸] و ہمام[۹] و محمد یختی[۱۰] | ملکِ قمی[۱۱] و ملائے حسین نقشی[۱۲]

میر فتح اللہ شیرازی[۱۳] و قاضی کمال[۱۴]
حاجی افضل[۱۵] و مشکیں قم[۱۶] و شیخ جلال[۱۷]

۱؎ اکبر اور جہانگیر کے درباریوں میں یہ خطاب تین آدمیوں کا تھا (۱) بیرم خاں جو ہمایوں کے عہد سے والبتہ دربار تھا المتوفی سنہ ۹۶۸ھ (۲) منعم خاں پسر بیرم خاں المتوفی سنہ ۹۸۳ھ (۳) عبد الرحیم خانِ خاناں المتوفی سنہ ۱۰۳۶ھ ۲؎ شیخ ابو الفضل دربارِ اکبری کا مشہور علامہ المتوفی سنہ ۱۰۱۱ھ ۳؎ مولانا نظام الدین ضمیری بلگرامی المتوفی سنہ ۱۰۰۳ھ ۴؎ مولانا جمال الدین عرفی المتوفی سنہ ۱۰۲۷ھ ۵؎ خواجہ خداوند دکنی اکبری دربار کا ڈیڑھ ہزاری منصب دار المتوفی سنہ ۹۹۵ھ ۶؎ صبوحی المتوفی سنہ ۹۷۳ھ ۷؎ شیخ ابو الفضل فیضی المتوفی سنہ ۱۰۰۴ھ ۸؎ میرزا جعفر قزوینی المخاطب بہ آصف خاں وزیر جہانگیر المتوفی سنہ ۱۰۲۱ھ ۹؎ اصل نام ہمایوں تھا مگر دربارِ اکبری میں حکیم ہمام نام تھا المتوفی سنہ ۱۰۰۳ھ ۱۰؎ محمد یختی المتوفی سنہ ۹۹۹ھ ۱۱؎ ملکِ قمی مشہور شاعر المتوفی سنہ ۱۰۲۵ھ ۱۲؎ ملا حسین نقشی مہر کن تھے المتوفی سنہ ۹۸۰ھ ۱۳؎ میر فتح اللہ شیرازی المتوفی سنہ ۹۹۷ھ ۱۴؎ قاضی ابو الفتح عرف قاضی کمال بلگرامی المتوفی سنہ ۱۰۱۰ھ ۱۵؎ حاجی افضل بلگرامی المتوفی سنہ ۹۸۰ھ ۱۶؎ میر عبد اللہ ترمذی مخاطب مشکیں رقم المتوفی سنہ ۱۰۳۵ھ ۱۷؎ شیخ جلال المتوفی سنہ ۹۸۹ھ

طالب[۱۸] آملی و شیخ سلیم[۱۹] چشتی — حافظ رخنہ[۲۰] و نور اللہ[۲۱] و قاسم[۲۲]، علوی[۲۳]

نور دین[۲۴]، شیخ مبارک[۲۵]، شہ عارف[۲۶] نامی — شمس دین[۲۷]، خان زمان[۲۸]، یوسف[۲۹] و ملا طاری

حضرت غوث[۳۰] و ضیاء اللہ[۳۱] و عبد القادر[۳۲]

مشہدی[۳۳]، کوکہ[۳۴]، ابو الفتح[۳۵]۔ رفیع[۳۶] شاعر

بیگ خان[۳۷] تردی و شیخ احمد[۳۸] الف ثانی — شیخ عبد النبی[۳۹] و شیخ گدائی[۴۰] بخشی[۴۱]

میرزا شاہ رخ[۴۲] و عدل[۴۳] و حکیم مصری[۴۴] — خان غازی[۴۵] و معالی[۴۶] و رفیع صفوی[۴۷]

ناصر الملک[۴۸] و علائی[۴۹] و شہ عبد[۵۰] غفور

مرتضیٰ[۵۱]، خان جہاں[۵۲]، خواجہ[۵۳] امینا[۵۴]، منصور[۵۵]

۱۸؎ ملک الشعرا طالب آملی المتوفی ۱۰۳۵ھ ۱۹؎ حضرت شیخ سلیم چشتی مشہور بزرگ المتوفی ۹۷۹ھ ۲۰؎ حافظ رخنہ المتوفی ۱۰۰۰ھ ۲۱؎ قاضی میر نور اللہ شستری المتوفی ۱۰۱۹ھ ۲۲؎ سید نجم الدین نام - ابو القاسم کنیت - کاہی تخلص - المتوفی ۹۸۸ھ ۲۳؎ شیخ وجیہ الدین گجراتی علوی المتوفی ۹۹۸ھ ۲۴؎ حکیم نور الدین المتخلص بہ قراری المتوفی ۹۸۳ھ ۲۵؎ مبارک اللہ عرف شیخ مبارک والد فیضی و ابو الفضل المتوفی ۱۰۰۱ھ ۲۶؎ شاہ عارف حسینی المتوفی ۱۰۰۶ھ ۲۷؎ حکیم الملک شمس الدین گیلانی المتوفی ۹۸۹ھ ۲۸؎ امیر الامرا خان زماں علی قلی خان سیستانی المتوفی ۹۷۵ھ ۲۹؎ محمد یوسف درباری اکبر المتوفی ۹۷۰ھ

(بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

اکثر ان میں ہیں وہی نام جو تھے درباری — جن کو اکبر سے عنایت ہوئی منصب داری
اہلِ دربار کی فہرست نہیں یہ ساری — سب گنے جائیں تو ہو جائے کتاب اک بھاری

ہے فقط اسم شماری یہ نمونے کے بطور
ورنہ درباریوں کے نام ہیں باقی ابھی اور

سب کے سب ان میں تھے نام آور و صاحب اقبال — بدرِ کامل کوئی تھا کوئی تھا خورشید کمال
سب کے اوصاف کی تشریح ہے اک طولِ خیال — مختصر یہ ہے انھیں سے تھا سب اکبر کا جلال

شاہ، گر ان میں نہ تھا کوئی تو حیرت کیا ہے
شاہ گر جب تھے تو پھر اور حقیقت کیا ہے

(سلسلہ نوٹ صفحہ ۷۲) ۳۰؎ ملا علی محدث قاری تخلص - المتوفی ۱۰۱۴ھ ۳۱؎ سید محمد غوث گوالیاری المتوفی ۹۷۰ھ ۳۲؎ شیخ ضیاء اللہ المتوفی ۱۰۰۵ھ ۳۳؎ ملا شیخ عبد القادر بدایونی المتوفی ۱۰۰۴ھ ۳۴؎ ملک الشعراء مولانا غزالی مشہدی المتوفی ۹۸۰ھ ۳۵؎ مرزا عزیز کوکہ المخاطب باعظم خاں المتوفی ۱۰۳۳ھ ۳۶؎ مسیح الدین حکیم ابوالفتح گیلانی برادر حکیم ہمام المتوفی ۹۹۷ھ ۳۷؎ رفیع الدین نام - دکن وطن - شاعر دربار اکبر - المتوفی ۱۰۱۰ھ ۳۸؎ تردی بیگ خاں ترکستانی - ہمایوں کے عہد سے وابستۂ دربار تھے ۳۹؎ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی مشہور بزرگ المتوفی ۱۰۳۵ھ ۴۰؎ شیخ عبد النبی صدر المتوفی ۹۹۰ھ ۴۱؎ شیخ گدائی کمبوہ المتوفی ۹۷۶ھ (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

ایک دربار کی اک شہ کی یہ تھی حالت
ملک بھر کا ہو جو اچھا تو یہ پہنچے کثرت
گننے والوں کو ہو گننے میں نہایت دقت
سیکڑوں کیا کہ ہزاروں پہ ہو اُن کی نوبت

اس سے اندازہ تعلیمِ سلف ہوتا ہے
جس سے لیتا ہے سبق وہ جو خلف ہوتا ہے

(بسلسلہ نوٹ صفحہ ۷۳) ۴۲؎ شیخ نظام الدین احمد المتخلص بہ بخشی صاحب طبقاتِ اکبری سنہ ۱۰۰۳ھ ۴۳؎ میرزا شاہ رخ المتوفی سنہ ۱۰۱۶ھ ۴۴؎ سید محمد میر عدل علاقۂ سنبھل کے رہنے والے تھے المتوفی سنہ ۹۱۶ھ ۴۵؎ حکیم مصری دکنی شاہی طبیب ۴۶؎ قاضی نظام بدخشی مخاطب بہ غازی خاں المتوفی سنہ ۹۹۲ھ ۴۷؎ شاہ ابو المعالی خواجگانِ کاشغر کے گھرانے سے تھے المتوفی سنہ ۹۷۱ھ ۴۸؎ سید رفیع الدین صفوی ہمایوں کے درباری تھے ۴۹؎ ناصر الملک ملا پیر محمد خاں اکبر کے درباری تھے ۵۰؎ شیخ علائی صوبۂ بنگال کے ساکن المتوفی سنہ ۹۵۶ھ ۵۱؎ شاہ عبد الغفور عرف بابا کپور اکبری عہد کے مجذوب تھے المتوفی سنہ ۹۷۹ھ ۵۲؎ میر مرتضیٰ شریفی سید شریف جرجانی کی اولاد میں تھے سنہ ۹۶۴ھ تک زندہ تھے بعد وفات امیر خسرو دہلوی کے جوار میں دفن ہوئے ۵۳؎ حسین قلی خان خانِ جہاں۔ بیرم خاں خانِ خاناں کا بھانجا المتوفی سنہ ۹۸۶ھ ۵۴؎ خواجہ امین الدین تبریزی مشہور خواجہ امینا مخاطب بہ خواجہ جہاں۔ المتوفی سنہ ۹۸۳ھ ۵۵؎ خواجہ منصور المتوفی سنہ ۹۸۹ھ (ماخوذ از دربارِ اکبری و مفتاح التواریخ)

اک وہ تھا عہدِ قدیم ایک یہ ہے عصرِ جدید — جامۂ کہنہ کی یک لخت ہوئی قطع و برید
نہ وہ تعلیم و تعلّم ہے نہ وہ گفت و شنید — ہے ہر اک رنگ ہر اک بات میں گویا تجدید

ایشیائی روش و طرز کے انداز نہیں
وہ ترانے نہیں وہ دُھن نہیں وہ ساز نہیں

نہ وہ عالم نہ وہ علم اور نہ وہ شانِ تعلیم — نہ وہ مکتب نہ وہ حافظ نہ میاں جی نہ حکیم
نہ وہ شاعر نہ وہ اشعار نہ وہ طبعِ سلیم — مٹ گئیں صفحۂ عالم سے تصاویرِ قدیم

نہ وہ مے خانہ نہ مے کش ہیں نہ وہ ساقی ہے
بس اک اللہ کا ہی نام کہ وہ باقی ہے

آ گئی ہم پہ یکایک یہ تباہی کیسی — روشنی میں نظر آتی ہے سیاہی کیسی
علم و دولت نے رفاقت یہ نباہی کیسی — ہوئی دنیا پلٹ ہی یہ الٰہی کیسی

سو برس پہلے جو حالت تھی وہ حالت نہ رہی
تیغِ ہندی کی وہ بُرّش وہ اصالت نہ رہی

کہتے ہیں سب کہ ترقی کا ہے اصلی یہی دور — ہو گئی ہے روشِ کہنہ ہر اک قابلِ غور
پہلے انداز تھا اور اب ہوا اور سے اور — قابلِ وقعت و عزت نہیں پچھلا کوئی طور

مشرقی علم و ادب کو کوئی پڑھتا ہی نہیں
زینہ موجود ہے لیکن کوئی چڑھتا ہی نہیں

دیکھ لی ایک صدی کی یہ ترقی یہ بہار ۔۔۔ اب ذرا ایک صدی کا ہو تنزّل بھی شمار

تیرھویں پچھلی صدی میں جو بچے تھے دو چار ۔۔۔ ہو گئے راہیِ فردوس مٹے سب آثار

نام اُن نامیوں کے آج سُنائیں کن کو

اجنبی لوگ نظر آتے ہیں دیکھو جن کو

یادگار اُن کی جو دو شخص تھے فرخندہ خصال ۔۔۔ اُن کو بھی کھا گئی موت اُٹھ گئے وہ بھی امسال

نذرہ اُٹھے کیا کہ ہوا خاتمۂ فضل و کمال ۔۔۔ جانشیں اُن کا ملے کوئی یہ ہے خام خیال

ہائے اک ساتھ گئے شبلی و حالی دونوں

کر گئے میکدۂ علم کو خالی دونوں

تھے یہ دونوں چمنستانِ ادب کے بلبل ۔۔۔ منبعِ علم و عمل - راہ نما شمعِ سُبل

اُن کے نغموں میں بھری رہتی تھی کیفیتِ مُل ۔۔۔ مستی انگیز تھی مینائے سخن کی قلقل

علم کا جب تک اثر زیرِ فلک باقی ہے

اُن کے انوارِ لیاقت کی چمک باقی ہے

فلکِ علم کے شمس العلما تھے دونوں ۔۔۔ ملکِ شہرت کے رئیس العرفا تھے دونوں

کیا زمانے [illegible] تھے دونوں ۔۔۔ [illegible] نہیں ایسے ملا ہے دونوں

یادگارِ سلف ایسے نظر آنے کے نہیں

جو ہیں، وہ نبض شناس اپنے زمانے کے نہیں

فنِ تاریخ و ادب فیض رساں ہے جب تک　　نثر اور نظم کا دنیا میں نشاں ہے جب تک
مکتبِ درس میں معنی و بیاں ہے جب تک　　صاحبِ نطق کو پروائے زباں ہے جب تک

نام ان ناموروں کے ہیں درخشاں ایسے
آسماں پر ہیں چمکتے ہوئے تارے جیسے

ان کی خدمات ہیں مثلِ مہِ تاباں روشن　　کون واقف نہیں اس سے کہ وہ تھے کاملِ فن
کیا کلام ان کے کمالوں میں کریں اہلِ سخن　　پا چکا حسنِ قبول ان کا ہر اک فعلِ حسن

کب وہ بے کار کوئی کام کیا کرتے تھے
رات دن خدمتِ اسلام کیا کرتے تھے

کارنامے بہت ان کے ہیں مگر کم از کم　　وہ تصانیف جنھیں لکھ رہا ہے عالم
ان میں سے بعض مضامین یہاں ہوں گے رقم　　تاکہ معلوم ہو ان کا فیضانِ قلم

اصل مطلب سے اب آغازِ سخن ہوتا ہے
یعنی اک اک کا بیاں منفرداً ہوتا ہے

سیرتِ حضرتِ فاروق و امامِ اعظم　　حضرتِ مولوئ روم کے حالات و شمیم
عہدِ مامون کے بیانات خیالاتِ اتم　　الکلام اور کئی تذکرۂ شعرِ عجم

یہ تصانیف ہیں سب شبلی نعمانی کی
دھوم ہے چار طرف جن کی سخن دانی کی

سب سے افضل ہی مگر ایک وہ آخر تالیف — جس سے بہتر نہ ہوئی ہی نہ کوئی ہوگی تصنیف
صدق نیت سے نہ کس طرح کریں ہم توصیف — کہ وہ ہیں بانیِ اسلام کے حالاتِ شریف

جسم اگر اور تصانیف ہیں تو جان وہ ہی
ہر مسلمان کے پندار میں ایمان وہ ہی

ان کتابوں کے سوا اور کتابیں بھی ہیں چند — قوم کے واسطے ہر طرح جو ہیں فائدہ مند
کردیا نظم کی قیدوں نے کچھ ایسا پابند — نام موزوں نہ ہوئے کوشش و کد کی ہر چند

نام لکھنے کی ضرورت نہیں سب جانتے ہیں
اہل علم اُن کی تصانیف کو پہچانتے ہیں

اور اک کام ہی تالیفِ کتب سے بھی سوا — ہفت اقلیم میں جس کام نے مشہور کیا
واہ کیا کام ہی جس کام میں یہ نام ہوا — بن کے خادم وہ ہر اک شخص کا مخدوم بنا

سب کو معلوم ہی مخفی کوئی اسرار نہیں
کون ندوے کی حقیقت سے خبردار نہیں

حاشیہ صفحہ ۷۷ و ۷۸۔

۵۱ الفاروق۔ ۵۲ سیرۃ النعمان ۱۲ ۵۳ سوانح عمری مولوی روم ۱۲ ۵۴ المامون ۱۲ ۵۵ الکلام ۱۲ ۵۶ شعر العجم پانچ جلد ۱۲ ۵۷ سیرت نبوی جو زیر تالیف تھی اور اب نامی پریس کانپور میں زیر طبع ہے۔

قوم تعلیم و تعلّم کو بھلا بیٹھی تھی — بختِ بیدار کو کم بخت سُلا بیٹھی تھی
مُردہ دل بن کے وہ یاروں کو رُلا بیٹھی تھی — اپنے سر جتنی بلائیں تھیں بُلا بیٹھی تھی

ایسے ہی چند بزرگوں نے دل افزائی کی
قوم جو مر رہی تھی اُس کی مسیحائی کی

آج سے بیس برس پہلے کا یہ ہے مذکور — کہ ہوئے جمع کچھ اہلِ خرد و اہلِ شعور
اور آپس میں کیا مشورۂ چند اُمور — اُسی اجمال کی تفصیل ہے ندوے کا ظہور

اختلافات کی اول بہت اُفتاد پڑی
آخرِ کار مگر، ندوے کی بنیاد پڑی

فی الحقیقت غرضِ ندوہ نہیں غیر مفید — شہد کو زہر کہے کوئی یہ ہے امرِ بعید
اچھی تعلیم کی ہر وقت ضرورت ہے شدید — اور رفتارِ زمانہ کی ہے واجب تقلید

چاہیے سب کو زمانے کی ہوا پر چلنا
ورنہ انجام میں ہوگا کفِ حسرت ملنا

غرض اس نیک عمل کے تھے جو سچّے عامل — کوئی ذاتی غرض اُن کی نہ تھی اس میں شامل
سب کے سب تھے فلکِ علم کے ماہِ کامل — رازِ قدرت کے خبردار و ہیں حامل

قوم کا، اُن کی ہے کوشش سے مقدّر چمکا
مشرقِ علم کا پھر مہرِ منوّر چمکا

سربرآوردہ تھے اس صف میں جناب شبلی — وہ نہ ہوتے تو نہ پاتا وہ ترقی اتنی
سعی و کوشش سے اُنھیں کی ہے یہ نوبت پہنچی — کہ بنی دارِ علوم ایک خیالی بستی

نقشہ جب تک ہے یہاں صورتِ انسانی کا
نام ندوے میں ہے ضم شبلی نعمانی کا

اُٹھ گیا ہائے زمانے سے وہ فخرِ دوراں — جس کے ماتم میں ہے آج ایک زمانہ نالاں
اُس کا ہمسر نظر آتا نہیں کوئی انساں — مسندِ علم کا وارث کوئی ایسا ہی کہاں

تربتِ حضرتِ شبلی جو نظر آتی ہے
آنکھ ہر اک کی اُسے دیکھ کے بھر آتی ہے

آج جس شان کے عالم کی ہے عالم کو تلاش — نظر آتی نہیں وہ شکل وہ صورت وہ قماش
کیا تعجب ہے جو اپنے علما ہوں خوش باش — مگر افسوس جسے دیکھیے مفلس قلاش

فاقہ مستی کا لقب فقر و غنا رکھا ہے
اپنی ہستی کو بُری طرح مٹا رکھا ہے

بادۂ عُجب و تکبر نے کیا ہے مغرور — نشۂ بغض و تعصب سے ہوئے ہیں سب چور
اپنے ہم جنس سے ہم قوم سے بے وجہ نفور — علم ہے پاس عمل سے ہیں مگر کوسوں دور

دوسروں کے لیے ہے وعظ و نصیحت کیا کیا
نظر اس پر نہیں، اپنی ہے فضیحت کیا کیا

ان معائب سے مبرا تھے مگر نعمانی ۔۔۔ نہ ریا اُن میں نہ تھا کبر نہ بالا خوانی
نہ کسی اپنے معاصر سے لڑائی ٹھانی ۔۔۔ نہ کبھی آبروئے علم پہ پھیرا پانی

زندگی ختم بڑی عزت و توقیر سے کی
اپنی امداد یہ سب اپنی ہی تدبیر سے کی

گریہ ہم کیوں نہ کریں آہ بھی ہم کیوں نہ کریں ۔۔۔ ایسے نام آور و علامہ کا غم کیوں نہ کریں
اہل علم اُن کے لیے رنج و الم کیوں نہ کریں ۔۔۔ مرثیے اُن کے رقم اہلِ قلم کیوں نہ کریں

رنج اس مرگ پہ کیوں کر نہ کرے گا کوئی
سب مریں گے، مگر ایسا نہ مرے گا کوئی

ابھی شبلی کا کفن بھی نہ ہوا تھا میلا ۔۔۔ دامِ صیادِ اجل کا نئے سر سے پھیلا
لے چلا بھر کے وہ فتراک کا اپنے تھیلا ۔۔۔ کر گئے حضرتِ حالی بھی قضا وا ویلا

چھپ گئے شمس و قمر، بچھ گئیں ماتم کی صفوف
ہو گیا ڈیڑھ مہینے میں کسوف اور خسوف

سالِ ہجری میں ہی تھا اک شب ۔۔۔ کہ ہوئی شبلی مرحوم کی جنت سے طلب
عیسوی سال بھی ہونے لگا رخصت جب ۔۔۔ دے گئے حالی مغفور غم و رنج و تعب

نسبت پاک جو تھی کر گئے ظاہر دونوں
سالِ آخر کی طرح ہو گئے آخر دونوں

کوئی پوشیدہ و مخفی نہیں حالِ حالی | حال کے ساتھ ہی وابستہ مقالِ حالی
صورتِ بدر ہی رخشندہ کمالِ حالی | آج دنیا میں نہیں کوئی مثالِ حالی

دل ہی پژمردہ طبیعت میں بحالی نہ رہی
خاک ہستی کہ یہاں صورتِ حالی نہ رہی

اپنے اسلاف کی تصویرِ مجسّم وہ تھے | گو مؤخّر تھے مگر فخرِ مقدّم وہ بھی تھے
کاملِ فن وہ تھے استادِ مسلّم وہ تھے | نالہ کش ہجر میں جن کے لیے ہیں ہم وہ تھے

آدمی ایک نہیں لاکھ نظر آئیں گے
مگر ایسے نہ بشر بارِ دگر آئیں گے

گو بظاہر انھیں سب جانتے ہیں شاعر | مگر اب تک نہیں اس راز سے اکثر ماہر
جو حقیقت میں ہیں شاعر وہ ہیں شاذ و نادر | شاعری کے لیے درکار ہی علم وافر

علما کا ہی یہ حق ہے منصب جہّال نہیں
یہ تفنّن کوئی بازیچۂ اطفال نہیں

حاشیہ متعلق صفحہ ۸۱ -

سنہ ۵۱ ۲۹ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۲ ہجری کو مولانا شبلی کا انتقال ہوا - اور دوسرے روز سنہ ۱۳۳۳ ہجری شروع ہوا -

سنہ ۵۲ ۳۰ - دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو مولانا حالی نے رحلت کی اور دوسرے روز سے سنہ ۱۹۱۵ء کی ابتدا ہوئی -

رتبہ شاعر کا حقیقت میں ہے اس درجہ بلند | کہ نہ پہنچے گی جہاں عالمِ خیالوں کی کمند
طبعِ موزوں کی مدد بھی ہے بہت فائدہ مند | مگر آتا نہیں بے اپڑھ کے قابو میں سمند

جب تلک امداد نہ ہو علم کی افزونی سے
کام چلتا نہیں کچھ طبع کی موزونی سے

واعظ و شاعر و سیاح و وکیل و قاضی | کرنی پڑتی ہے زمانے کی جنھیں نباضی
گر نہ ہوں عالمِ مستقبل و حال و ماضی | خاک پھر مدِ مقابل کو کریں گے راضی

مرجعِ خلق بنایا ہے خدا نے ان کو
اس لیے علم کے بخشے ہیں خزانے ان کو

شاعرِ کاملِ فن حضرتِ مولانا تھے | علم و عقل و ہنر و فضل میں فرزانا تھے
صائب الرائے تھے فنا خود دو انا تھے | فحش جذبات و خیالات سے بیگانا تھے

شاعری کے لیے تھے موجدِ اندازِ جدید
محفلِ شعر میں وہ چھیڑ گئے سازِ جدید

جس نے دیکھا ہے تصانیف کو حالی کی بغور | اس کو معلوم ہے کیا شان تھی ان کی کیا طور
تھا مبارک شعرا کے لیے مرحوم کا دور | اب کوئی ان کا مخالف ہو تو یہ بات ہے اور

تھے خوشامد طلب اصلا نہ وہ درباری تھے
نہ مثالِ شعرا شاکی ناداری تھے

شاعری کرتے تھے، پیشہ نہ سمجھتے تھے مگر — تھی نظر اپنی لیاقت پر اُنھیں آٹھ پہر
ذاتی اغراض کسی وقت نہ تھیں مدِّ نظر — بلکہ ہر کام میں تھا نفعِ بنی نوعِ بشر
اپنے مُنھ سے کوئی فقرہ بھی نہ بے سود کہا
جب کہا شعر تو وہ مُشعرِ بہبود کہا

ہے جو مجموعۂ نظم اُن کا وہ بے مثل ہے سب — خالی از فائدہ گویا نہیں کوئی مطلب
آشنا حرفِ غلط سے نہ ہوئی جنبشِ لب — فرد فرد اُن کی ہے روحِ سخن و جانِ ادب
شک ہو جس کو تو وہ مرحوم کا دیوان دیکھے
لطفِ شعر و سخن و شانِ سخن داں دیکھے

دیکھیے نظم میں جزر و مدِ اسلام کی شان — جس پہ سارے شعرا کے ہیں دواوین قربان
اس مسدس کا ہر اک شعر ہے ایمان کی جان — اکثر اشعار کا جس کے ہے مؤیّد قرآن
سب سے اعلیٰ ہے جو تصنیفِ مقدّس وہ یہ ہے
شش جہت میں ہے جو مشہور مسدّس وہ یہ ہے

اس مسدس کے سوا اور بھی ہیں مثنویاں — بعض نظموں کے جداگانہ ہیں قائم عنواں
اور قطعات و غزل سے بھی ہے زیبِ دیواں — ہر طرح سب کا دل آویز ہے اندازِ بیاں
اُن کے دیوان میں ہر صنفِ سخن پائیں گے
اثر و درد بہت ماہرِ فن پائیں گے

ان کی نظموں کو جو بخشی ہے خدا نے تاثیر　　اس اثر کی نہیں ملتی ہے کہیں اور نظیر
وہ دل آویز وہ دلچسپ ہے شانِ تحریر　　کر لیا کرتی ہے بے ساختہ دل کو تسخیر

گو کہ ہم عہد ہیں ہم لوگ فدا افضل نہیں
مگر اب جو ہیں وہ ہیں نقل کوئی اصل نہیں

اہل فن ان کو سمجھتے تھے کہ بات ہیں فرد　　نظم کی طرح وہ تھے نثر کے میداں میں بھی مرد
ان کی نثریں تھیں جو دلچسپ تو نظمیں پُر درد　　گرم بازاریِ مضمون کو جو کر گئے سرد

پانسا الٹا ہوا اب کہنہ خیالی کا ہے
رائج الوقت جو سکّہ ہے وہ حالی کا ہے

ہائے اے خطۂ ہند اے وطنِ اہلِ کمال　　کیا ہوئی آج تری شانِ عروج و اقبال
عہدِ ماضی کی طرح اب نظر آتا نہیں حال　　جس طرف دیکھیے موجود ہیں ادبار و زوال

دولتِ علم ہے باقی نہ وقارِ قومی
لے گئے چھین کے اغیار شعارِ قومی

پڑھیے اب فاتحہ خیر کہ ہر بات گئی　　وہ زمانہ گیا وہ دن گئے وہ رات گئی
شوکتِ قوم گئی شانِ کمالات گئی　　قصّہ کوتاہ بزرگوں کی کرامات گئی

دولتِ علم بچی بھی تھی جو کچھ لے دے کر
چل دیے شبلی و حالی سوئے جنت لے کر

نظامی پریس کی ایک آنہ لائبریری

(منیجر نظامی پریس بدایوں سے منگائیے)

(نوٹ) مندرجہ ذیل آٹھ کتب جن میں سے ہر ایک کی قیمت ایک آنہ ہے اگر ایک ساتھ منگائی جاویں تو بجائے ۱۰؍ کے صرف ۸؍ کا وی پی مع محصول وغیرہ بھیجا جائیگا۔

۱- **بنی جی کی خوشی** (زنانہ مولود شریف) لڑکیوں کے لیے۔

۲- **بچوں کا حساب**- زبانی حساب کے گر- اردو ہندسے اور پہاڑے۔

۳- **ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیا دار کی کہانی** مصنفہ سرسید مرحوم

۴- **انشاء اللہ**- ایک پر لطف مکالمہ مصنفہ سرسید مرحوم۔

۵- **راکھ بیگم**- بچوں کے پڑھنے کے قابل آسان نظم۔

۶- **بدمزاج شوہر**- بچوں بچیوں کے لیے نہایت آسان اور عام فہم نثر کا قصہ۔

۷- **مرزا اچھویا**- علی گڑھ کالج کے متعلق ایک پر لطف نظم مصنفہ مسٹر سجاد حیدر بی اے

۸- **مرثیہ مرزا غالب** مصنفہ مولانا حالی مرحوم۔

نظامی پریس بدایوں

میں لکھائی، چھپائی کا خاص اہتمام ہے۔
اگر آپ اس سے کام لینا چاہتے ہیں تو
مینیجر سے شرح چھپائی دریافت کیجیے۔

مینیجر